بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

روزوں کی غرض و غایت

روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعت مؤمنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم۔ صدر اول کی جماعت مؤمنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی..... آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ لتکبرو اللہ علیٰ ما ھدٰکم۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن مجید نے تمام مؤمنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ (Reservists) ہوتے ہیں وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقت ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مؤمن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ سے جب سوال کیا گیا کہ مؤمن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہا دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: شھر رمضان الذی انزل فیہ القران (۲/۱۸۵)۔ ''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاع گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔'' لہٰذا جسے عیدالفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشن نزول قرآن ہے۔ قرآن خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبرو اللہ علیٰ ما ھدٰکم۔ تا کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی

جائے۔لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہوگیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔''تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو۔''یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔اس بڑائی بیان کرنے کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔اذان۔نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ وفغاں کہا تھا کہ: ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمت ہو پرکشا تو.....

سطح بین نگاہیں زندگی کی بے پایاں وسعتوں کو سماعت' بصارت' گویائی جیسے حواس تک ہی محدود دیکھتی ہیں۔لیکن قرآن بتاتا ہے کہ جب زندگی ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی پیکر آدم میں نمودار ہوئی تو اس میں ایک ایسا انقلاب آیا جس کا نشان تک زندگی کی نچلی سطح میں نہیں تھا۔ یہ انقلاب انسان کی ذات (Personality) کا مظہر تھا۔جس کی نمود انسان کے عزم و ارادہ سے ہوئی ہے۔جس قدر پختہ عزم اتنی ہی مستحکم انانی خودی' ویسے تو انسانی عزم کے نمود' آثار و مظاہر ہمیں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اس کی نمود اس شدت اور تابندگی سے ہوتی ہے کہ انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ممکنات زندگی کی پہنائیاں کس قدر حدود فراموش ہیں۔

اگر زندگی کی بے پناہ قوت کان' آنکھ' زبان تک ہی محدود ہوتی تو آج دنیا ہیلن ایڈمز کیلر (Hellen Adams Keller) کا نام بھی نہ جانتی اور نام جانتی بھی کیا وہ شاید بھیک مانگتے مانگتے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی۔لیکن

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

اور ملک خدا کی وسعت کا پیمانہ کسی گدا کر لنگڑا پاؤں نہیں ہے بلکہ فرد جری کے عزم و ہمت سے ہوتا ہے جو قدم قدم پر اقدار انسانیہ کے تازہ جہاں آباد کرتا جاتا ہے۔مس کیلر اس کی زندہ مثال ہے۔مس کیلر ایک اندھی اور بہری عورت ہے وہ تہتر سال سے اندھی اور بہری چلی آ رہی ہے۔تہتر سال بین ثبوت ہیں اس حقیقت کبریٰ کا کہ جب زندگی اپنی نمود چاہتی ہے تو حواس طاہری سے محرومی اس عمل کو نہ روک سکتی ہے نہ واژگوں کر سکتی ہے بلکہ وہ عمل کے لئے مہمیز بن جاتی ہے۔

مورخہ 27 جون 1880ء کو تسکمبیا (امریکہ) میں پیدا ہوئی وہ ابھی بمشکل انیس مہینے کی ہوئی تھی کہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر بصارت اور گویائی سے محروم ہو گئی۔ بچے اندھے ہو جاتے ہیں۔اندھے پیدا بھی ہوتے ہیں (اور ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ دیکھتے نہیں۔ وہ اندھے ہی نہیں ہوتے اوروں کو بھی اندھا کرتے ہیں) لیکن تین چتھائی صدی ادھر کون کہہ سکتا تھا کہ ان گنت اندھوں میں سے یہ حقیر و ناتواں بچی جو خود بولنے اور دیکھنے کی نعمتوں سے محروم ہو چکی تھی دنیا کے معذور انسانوں کے لئے آیۂ رحمت بن جائے گی۔ وہ ہمدردی خدمت اور محنت کی قندیل لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرے گی اور اس کرۂ ارض کو منور کرتی چلی جائے گی۔

کیلر چھ سال کی عمر کو پہنچی تو اس کے والدین نے مس اینی مینسفیلڈ سلیون کو (جو بعد میں شادی کر کے مسز جان میکی مشہور ہوئیں) بچی کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔مس سلیون کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ وہ خود اندھی ہو گئی تھی لیکن علاج سے اسے روشنی کی

چند کرنیں میسر آ گئی تھیں وہ بوسٹن کی اندھوں کی پرا کنزانسٹی ٹیوٹ کی فارغ التحصیل تھی۔ کیلر اس وقت تک اندھی اور بہری ہی نہیں تھی۔ گونگی بھی تھی۔ لیکن مس سلیون نے ایک ہی مہینے میں اپنے نئے شاگرد کو بولنا سکھا دیا۔ مس سلیون کی نگرانی میں اندھوں، بہروں کے سکول میں داخل ہو کر کیلے نے لکھنا پڑھنا اور بولنا ہی نہ سیکھا بلکہ تعلیم میں غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ 1902ء میں اس نے اپنے سوانح حیات لکھی اور 1903ء میں ''رجائیت'' (Optimism) کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ اس کے بعد کم ازکم چار کتابیں اور تصنیف کیں 1904ء میں وہ گریجویٹ بن گئی۔ سلیون اور کیلر کا جوڑا خوب تھا۔ ایک اعلیٰ استاد تھی تو دوسری عمدہ شاگرد۔ دونوں نے مل کر ایک نئی دنیا تعمیر کر لی۔ ان کا ساتھ 1936ء میں ٹوٹا جب مس سلیون کا انتقال ہو گیا۔

کیلر کی زندگی، اندھوں، بہروں، گونگوں اور معذوروں کے لئے وقف ہے۔ اس نے اندھے اور گونگے پن سے جو کچھ کھویا اس سے کہیں زیادہ محنت شاقہ اور بے پناہ جذبات، ہمدردیٔ نوع انسانی سے حاصل کیا۔ یہ اس کی دولت ہے جسے وہ دنیا بھر میں لٹاتی پھرتی ہے۔ ان دنوں وہ عالمی دورے پر ہے۔ یہ دورہ فروری میں شروع ہوا تھا اور 23 جون کو اس کی پچھترویں سالگرہ سے چار روز پیشتر ختم ہو گا۔ اس چالیس ہزار میل کے دورہ میں وہ پاکستان، ہندوستا، برما، فلپائن اور جاپان کا چکر کاٹے گی تا کہ ان ممالک کی حکومتوں اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اندھوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے وہ آزادی اور مسرت کی زندگی گذار سکیں ان علاقوں میں اس کے اندازے کے مطابق کوئی ایک کروڑ اندھے ہیں۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہی فضا سازگار کرنا نہیں چاہتی بلکہ اسکے لئے بھی کوشاں ہے کہ قابل علاج، اندھا پن عدم توجہی یا ذرائع کی کمی سے مستقل نہ ہو جائے۔ یہ دورہ نجی نہیں بلکہ امریکہ کے اس ادارے کی طرف سے ہے جو سمندر پار کے اندھوں کی خدمت کے لئے بنایا گیا ہے محض یہی تصور کچھ کم خوش آئند نہیں کہ ایک ملک دوسرے ملک کے معذوروں کے لئے امدادی ادارہ قائم کرے لیکن اس پر مستزاد کیلر جیسے کارکن کا وجود ہے جس کی زندگی کا مقصد معذوروں کی خدمت ہے۔

کیلر کو ہوائی سفر کا بہت شوق ہے اور وہ ہوائی جہاز میں خاص لذت محسوس کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑنے والے بخارات کے پہاڑوں پر چڑھنا ایک عجیب تجربہ ہے''۔ مجھے اپنے آگے اور پیچھے خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور میں پھر کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں کرتی''۔ یہ حقیقت ہے کہ

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

مسز روز ویلٹ نے حال ہی میں کیلر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

''تم جہاں کہیں بھی جاتی ہو وہاں کے لوگوں کی ضروریات کو جانتی ہو اور ان کے مصائب کو سمجھ کہ ان کا مناسب ادا مہیا کرتی ہو۔ تما مانسان تمہارے خاندان کے افراد ہیں۔ اور تم خود وسیع تر انسانیت کا حصہ ہو۔''

اس سال 27 جون کو کیلر کی عمر پچھتر سال ہو جائے گی۔ اس عمر میں جہاں عام طور پر آرام کرنے اور ''اللہ اللہ'' کرنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے دنیا میں کشاں کشاں پھر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ اس کا جذبہ خدمت بڑھتا جا رہا ہے۔ کس قدر سچ کہا ہے اقبال نے کہ:

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صرف ایک سوال

یہ شکایت آج کی نہیں، صدیوں سے چلی آ رہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔۔ کسی خاص فرقہ۔ خاص گروہ۔ خاص ملک کے مسلمانوں نے نہیں۔ پوری کی پوری اُمتِ مسلمہ نے۔ بات ہے تو درست، لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی کسی نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کیا ہوا کہ پوری کی پوری قوم نے اسلام چھوڑ دیا۔ اور یہ ایک آدھ دن کی بات نہیں۔ صدیوں سے اس کی یہی حالت ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟ ایک بات تو بالکل واضح ہے۔۔ پہلے اسی پر غور کرنا چاہئے۔

آپ کسی کمیونسٹ سے پوچھئے کہ کمیونزم کسے کہتے ہیں۔ وہ صاف، واضح اور متعین الفاظ میں اس کا جواب دے دے گا۔۔۔ آپ یہ سوال متعدد کمیونسٹوں سے پوچھئے۔ ہر ایک کا جواب ایک ہی ہوگا۔ اس جواب کی روشنی میں آپ کے لئے یہ متعین کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا کہ فلاں شخص کمیونسٹ ہے یا نہیں۔ یا فلاں قوم نے کمیونزم کو چھوڑ دیا ہے یا وہ اس پر عمل پیرا ہے۔

اسی طرح آپ سوشلسٹوں سے، سوشلزم کے متعلق پوچھئے ان کے ہاں سے بھی متعین جواب مل جائے گا کہ سوشلزم کسے کہتے ہیں اور اس کے جواب کی روشنی میں آپ بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ فلاں شخص یا قوم نے سوشلزم کو چھوڑ دیا ہے یا نہیں؟

اس قسم کا سوال آپ مغربی جمہوریت کے متعلق پوچھئے۔ وہاں سے بھی آپ کو متعین جواب مل جائے گا۔

اس کے بعد آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ اسلام کیا ہے اور پھر دیکھئے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے، اور جب آپ یہی سوال مختلف مسلمانوں سے پوچھیں تو اس کے بعد دیکھئے کہ ان میں سے ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔ یہ بات ہم عوام کے متعلق نہیں کر رہے۔ حضرات علماء کرام سے یہ سوال کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان کے ہاں سے کیا جواب ملتا ہے اور ایک کا جواب دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتا ہے۔ ہم یہ بات محض نظری طور پر نہیں کہہ رہے۔ عملاً ایسا ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے (ختمِ نبوت تحریک کے سلسلہ میں) فساداتِ پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے (جسے عرفِ عام میں منیر کمیٹی کہا جاتا ہے) مختلف علماء کرام سے پوچھا کہ ''مسلمان کسے کہتے ہیں'' کمیٹی کی رپورٹ مطبوعہ شکل میں موجود ہے اس میں آپ دیکھئے کہ ان حضرات کی طرف سے اس سوال کا جواب کیا ملا تھا! ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا کہ اس سوال کا جواب دو چار فقروں میں دیا نہیں جا سکتا۔ اسکے لئے صفحات درصفحات درکار ہوں گے۔ جنہوں نے جواب دیا۔ ان کے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:۔

> ان علماء میں سے کسی دو کے جواب بھی ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے۔ (انگریزی رپورٹ۔ ص ۲۱۸)۔

آپ اس رپورٹ پر نہ جائیے۔ مختلف فرقوں کے علماء حضرات سے خود یہ سوال پوچھئے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی

تعریف (Definition) کیا ہے۔ ان کے جواب خود اس رپورٹ کی تائید کر دیں گے۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے، تو اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ جب ہم متعین اور متفق طور پر یہی نہیں بتا سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے تو ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہوگا کہ ''مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے۔'' یہ وجہ ہے جو ہم صدیوں سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے اور مسلمان ہیں کہ اسلام کو اختیار کرنے کا سوچتے تک نہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں پتہ ہی نہیں کہ انہوں نے کیا چھوڑ دیا ہے اور انہیں کیا اختیار کرنا چاہئے۔ ہم اتنا واضح کر دیں کہ مختلف فرقے اپنے اپنے فرقہ کے تصور کا اسلام تو بتا دیں گے۔ لیکن وہ اسلام جو ساری امت میں قدر مشترک ہے، جس کی طرف نسبت سے وہ امت، امت مسلمہ کہلاتی ہے اور جس کے متعلق شکایت ہے کہ اس نے اسے چھوڑ دیا ہے، اس کی بابت کوئی کچھ نہیں بتا سکے گا کہ وہ ہے کیا؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر اور تو اور، آپ خود بھی وقف تعجب ہو جائیں گے کہ جس بات کے متعلق کبھی ہم نے اتنا سوچنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ یہ بھی ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا چاہئے، وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی نکلی۔ اس کے بعد آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم تو خیر عامی ہیں۔ دین کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں، اس لئے ہم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے علماء کرام کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھی اس سوال کا متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ اور جب ان کی یہ کیفیت ہے تو پھر وہ امت میں اپنی موجودہ پوزیشن کو کس طرح قائم رکھے ہوئے ہیں اور لوگوں کو اسلام کے متعلق مطمئن کس طرح کر دیتے ہیں؟

اس کی ایک خاص ٹیکنیک ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے کچھ اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جن کا تقدس عوام کے دلوں میں راسخ کر دیتے ہیں۔ ان اصطلاحات کو مبہم رکھا جاتا ہے۔ یعنی ان کا واضح مفہوم بیان نہیں کیا جاتا۔ ہر موقع پر اس اصطلاح کو استعمال کر دیتے ہیں اور بس۔۔ مثلاً ان میں بنیادی اصطلاح خود اسلام ہے۔ آپ آئے دن ان حضرات کی زبانی اس قسم کے الفاظ سنتے رہتے ہیں کہ ''اسلام کا حکم یہ ہے'' اس معاملہ میں ''اسلام کا منشاء یہ ہے''۔ اس باب میں ''اسلام یہ کہتا ہے۔'' اب ظاہر ہے کہ ''اسلام'' کسی شخص کا نام نہیں جس کے متعلق سمجھا جا سکے کہ وہ ایسا کہتا ہے یا اس کا حکم یہ ہے۔ اس کے لئے کوئی سند یا حوالہ ہونا چاہئے جہاں سے معلوم ہو سکے کہ کون ایسا کہتا ہے۔ یہ کس کا حکم ہے۔ لیکن یہ حضرات کبھی حوالہ نہیں دیں گے، اسے ہمیشہ مبہم رکھیں گے۔ اس لئے کہ جب یہ کہیں گے کہ ''اسلام کا یہ فیصلہ ہے'' تو اکثر و بیشتر یہ فیصلہ ان کا اپنا ہوگا جسے یہ اسلام کا فیصلہ کہہ کر پیش کر دیں گے اور یا ان کے فرقہ کا فیصلہ۔ اب ظاہر ہے کہ کسی فرقہ کا فیصلہ تو اسلام کا فیصلہ نہیں کہلا سکتا۔ لیکن یہ اسے دانستہ مبہم رکھیں گے۔

اس قسم کی ایک اصطلاح ہے ''اسلامی شریعت'' یا ''شریعتِ حقہ''۔ آئے دن اس قسم کے الفاظ سننے میں آتے ہیں کہ شریعت کا یہ حکم ہے۔ شریعت کا یہ فیصلہ ہے۔ یہ از روئے شریعت ناجائز ہے۔ آپ دل میں سمجھتے ہوں گے کہ یہ اسلام کا فیصلہ ہے۔ لیکن یہ بھی درحقیقت کسی فرقہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر فرقہ کی شریعت الگ الگ ہے۔ جسے آپ ''اسلام کی شریعت'' کہیں گے۔۔۔ یعنی وہ شریعت جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں، اس کا کہیں وجود نہیں۔

ایک اصطلاح ''سنت رسولؐ اللہ'' ہے۔ اس کے متعلق تو آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ تمام مسلمانوں میں متفقہ علیہ ہوگی کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تو ایک ہی تھی

اس لئے حضور ﷺ کی سنت بھی ایک ہی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں۔ سنت رسولؐ اللہ بھی ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔ حتیٰ کہ ''سنت'' کی تعریف (Definition) تک بھی مختلف۔

یہ (اور اسی قسم کی کئی ایک اور) اصطلاحات ہمارے ہاں صدیوں سے رائج چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں چونکہ سیاست کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس لئے اب قدیم اصطلاحات کے بجائے، جن کا تعلق ''مذہب'' سے سمجھا جاتا ہے، نئی نئی اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں۔ ان میں ایک اصطلاح ''اقامت دین'' ہے۔ اس اصطلاح کی پبلسٹی تو بہت زیادہ ہوتی ہے، لیکن اسکا متعین مفہوم آج تک نہیں بتایا گیا۔ اگر اس اصطلاح کے مدعی اس کا مفہوم واضح کر دیں تو مختلف فرقوں کے علماء شور مچا دیں کہ جسے تم دین کہتے ہو، وہ دین ہے ہی نہیں۔ لہٰذا، ان حضرات نے بھی اسی میں خیریت سمجھ رکھی ہے کہ اس اصطلاح کو مبہم رکھا جائے۔

اب ''دین'' کے بجائے نظام کا لفظ زیادہ پاپولر ہو رہا ہے۔ اسکی بنا پر ایک اصطلاح ''اسلامی نظام'' ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں خود اسلام کا مفہوم ہی متعین نہیں، اس لئے ''اسلامی نظام'' کی اصطلاح بھی شرمندۂ معنی نہیں ہوئی، نہ ہوسکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی سیاست میں جس مقصد کے لئے سلوگن وضع اور اختیار کئے جاتے ہیں اس مقصد کے لئے ہمارے ہاں کے مذہبی طبقہ میں اس قسم کی اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ سلوگن سے مراد ہوتی ہے ایسے الفاظ جن کا مفہوم متعین نہ ہو لیکن جنہیں عوام میں پاپولر بنا کر فریقِ مقابل کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر ذرا بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ زمانۂ قدیم کے عصرِ سحر (Age of Magic) میں جو کام، جنتر منتر، ٹونا ٹوٹکا سے لیا جاتا تھا، وہی کام عصرِ رواں میں سلوگن سے لیا جاتا ہے۔ جنتر منتر یا ٹونے ٹوٹکے ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتے تھے جن کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اگر تم ان الفاظ کو اس طرح اتنی مرتبہ دہراتے جاؤ گے تو تمہارا دشمن مغلوب ہو جائے گا۔ بعینہٖ یہی پوزیشن ہمارے زمانے میں سلوگن نے لے رکھی ہے اور اب یہی کام ہمارے ہاں اصطلاحات سے لے لیا جاتا ہے۔ پھر جس طرح ایک سلوگن کچھ عرصہ کے بعد، کثرتِ استعمال سے غیر مؤثر ہو جاتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں کی اصطلاحات بھی کچھ عرصہ کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ کسی زمانے میں جو اثر، اقامت دین۔ حکومت الٰہیہ۔ اسلامی نظام وغیرہ قسم کی اصطلاحات پیدا کیا کرتی تھیں، اب یہ اس قسم کا اثر پیدا نہیں کرتیں۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ ایک نئی اصطلاح وضع کی جائے اور وہ اصطلاح ہے ''نظامِ مصطفیٰؐ''، چونکہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہمارے نہایت گہرے قلبی جذبات سے ہے، س لئے یہ اصطلاح، سابقہ اصطلاحات کے مقابلہ میں، عوام کے لئے زیادہ مؤثر اور پرکشش ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس اصطلاح کو بھی مبہم رکھا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ سنت رسولؐ اللہ کی طرح ہر فرقہ کا نظامِ مصطفیٰؐ کا تصور اپنا اپنا ہے۔

مختلف فرقوں کے علماء تو ایک طرف، خود حنفیوں میں بریلوی اور دیوبندی حضرات کے نزدیک اس کا مفہوم الگ الگ ہے۔ موجودہ ہنگاموں میں، بریلوی فرقہ کی نمائندگی مولانا نورانی کر رہے ہیں اور دیوبندی فرقہ کی مفتی محمود صاحب اور ان دونوں میں ''نظام مصطفیٰؐ'' تو ایک طرف ''مقام مصطفیٰؐ'' تک میں شدید اختلاف ہے۔ لہٰذا ان کی سیاسی مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس اصطلاح (نظام مصطفیٰؐ) کو مبہم رکھا جائے..... اس کا کوئی ایسا مفہوم پیش ہی نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقوں کے علماء متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کی وضاحت کا تقاضا کیا

جائے تو اسے بلند آہنگ الفاظ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔۔۔ مثلاً حال ہی میں ''نوائے وقت'' میں اس عنوان پر کہ ''نظام مصطفیٰؐ کیا ہے''۔۔۔ دو مبسوط مقالات شائع ہوئے ہیں۔ ایک مقالہ میں کہا گیا ہے کہ نظام مصطفیٰؐ:۔

> اخلاقی لحاظ سے نظامِ مساوات۔۔ سیاسی لحاظ سے نظامِ حفاظت و عدل۔۔ معاشی لحاظ سے نظامِ عدل و کفالت۔۔ روحانی لحاظ سے نظام ذکر و فکر اور للّٰہیت۔۔ معاشرتی لحاظ سے نظامِ اخوت ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء)۔

دوسرے مقالہ میں کہا گیا ہے۔۔۔ نظامِ مصطفیٰؐ کیا ہے؟

> کائنات گیر علم۔۔ یزداں شعار عبادت۔۔ پاکیزہ اخلاق۔۔ عظیم سیاست۔۔ علم خوفِ خدا کا سبب' اور خوفِ خدا دانش کی انتہا۔ (نوائے وقت' ۱۵ اگست ۱۹۷۷ء)۔

اس قسم کے ہیں حریر و اطلس کے وہ نرم و نازک پردے جن میں اس مصلحت (یا حکمت عملی) کو چھپایا جاتا ہے کہ اس نظام کا متعین مفہوم عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔۔ کیونکہ اس کی وضاحت سے اس دعویٰ کا پردہ چاک ہو جاتا ہے کہ اس مطالبہ میں تمام فرقوں کے نمائندے متفق ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔۔۔ یہ کتمانِ حقیقت کی اسی قسم کی سعیٔ ناکام ہے جس کی مثال پہلے بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں پر مشتمل اکیس علماء نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کا ضابطۂ قوانین ''کتاب و سنت'' کے مطابق مرتب کیا جائے گا اور اس کے بیس برس بعد' ''متفقہ مطالبہ'' کا پردہ خود ان ہاتھوں کو' جنہوں نے یہ پردہ لٹکایا تھا' یہ کہہ کر اٹھانا پڑا کہ:

> کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے مختلف فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ (مودودی صاحب)

اس سے' اکتیس علماء کے اس مطالبہ کا بھانڈا پھوٹ گیا جسے وہ ۱۹۵۱ء سے متفقہ طور پر اسلامی کہہ کر پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ یہ بیس پچیس برس تو خیر' نظری بحثوں میں گذر گئے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ اب یہ مطالبہ عملی شکل اختیار کر لے اور اس وقت اس اصطلاح کا متعین مفہوم سامنے لائے بغیر چارہ نہ رہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر اکتوبر ۷۷ء کے مجوزہ انتخابات کے نتیجے میں' زمامِ حکومت نظام مصطفیٰؐ کے مدعیوں کے ہاتھ میں آ گئی تو سب سے پہلا مرحلہ' پبلک لاز کا متفق علیہ ضابطہ مرتب کرنے کا درپیش ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مختلف فرقوں کے یہ نمائندے ایسا ضابطہ مرتب کر ہی نہیں سکیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا ہوگا؟

تحریک پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر استوار تھی۔ (۱) دو قومی نظریہ اور (۲) نظریۂ پاکستان یعنی اسلام کی بنیادوں پر ایک آزاد مملکت کا قیام۔ ہندو (اور ان کی ہمنوائی میں دنیا بھر کی دیگر اقوام) کہتے تھے کہ ان بنیادوں پر کوئی مملکت استوار نہیں ہوسکتی۔ وہ زمانہ لد گیا جب مذہب کی بنیاد پر سلطنتیں قائم کی جایا کرتی تھیں۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔

سقوط ڈھاکہ کے المیہ پر ہندو' اور ان کے ہم نواؤں نے' ببانگِ دہل اعلانات کئے کہ دیکھا ناں! جو کچھ ہم کہتے تھے وہ کس طرح سچ ثابت ہوا۔ دو قومی نظریہ کس طرح ناکام رہا؟ اور اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ جس طرح دو قومی نظریہ ناکام ثابت ہوا ہے' تم دیکھو گے کہ تمہارا دوسرا نظریہ' یعنی مذہب کی بنیادوں پر مملکت کی تشکیل۔۔ بھی اسی طرح ناکام ثابت ہوگا۔

اب' جب مختلف فرقوں کے علماء پر مشتمل پارلیمان' ایک متفق علیہ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کرنے میں ناکام رہی' تو ہمارے یہی دشمن ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کریں گے

کہ دیکھا! جو کچھ ہم کہتے تھے وہ بالآخر سچ ثابت ہو کر رہا یا نہیں!

یہ اسی روزِ بد کا لرزہ انگیز احساس ہے جو ہمیں ان حضرات کی خدمت میں گذارش کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ مملکت کا استحکام اور اسلام کا احیاء ہوگا' تو آپ جس قدر جلد اس غلط فہمی کو دور کر دیں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ آپ کی موجودہ روش سے مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور اسلام دنیا کی نظروں میں اضحوکہ بن جائے گا۔ اگر آپ فی الواقعہ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو پہلے یہ طے کر لیجئے کہ اگر قانون سازی کے اختیارات آپ کے ہاتھ میں آ گئے تو آپ وہ ضابطہ حیات کس طرح مرتب کریں گے جو آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پائے۔

اگر یہ حضرات ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں' تو ہم قوم سے بزور گذارش کریں گے کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے سلوگنوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے' ان سے مطالبہ کرے کہ وہ اس سوال کا واضح الفاظ میں جواب دیں۔

اس سوال کا جواب کچھ بھی مشکل نہیں۔ اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

(۱) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' نظام مصطفیٰؐ کے مدعی مختلف فرقوں سے متعلق ہیں۔ ان میں' ہر فرقہ کی فقہ (ضابطۂ قوانین) الگ الگ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک یہ حضرات اپنی اپنی فقہ کو غیر متبدل اسلامی شریعت قرار دیتے رہیں گے' کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ نے دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے لگا رکھے ہیں۔

(۲) ان سب میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ لہٰذا' ان کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کا' اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ یہ اپنی اپنی فقہ سے صرف نظر کر کے' قرآن مجید کو ضابطۂ قوانین کی بنیاد قرار دیں اور اسے قول فیصل اور حرف آخر تسلیم کریں۔

(۳) قرآن کریم سلوگن نہیں دیتا۔ وہ ہر بات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ **تبیانا لکل شئ** (۱۶/۸۹) اس کا دعویٰ ہے۔ یعنی ہر بات کو نکھار اور ابھار کر بیان کرنے والی کتاب۔

(۴) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہی یہ دی ہے۔ **ولو کان من عند غیر اللہ لوجد وافیہ اختلافا کثیرا** (۴/۸۲)۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اسمیں بکثرت اختلافات پاتے۔ لہٰذا قرآن مجید کو قدر مشترک تسلیم کر لینے کے بعد کوئی اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔

(۵) **الدین** ۔ یعنی نظام خداوندی۔ کے معنی ہیں خدا کو حاکم یا حَکم (ہر معاملہ میں فیصلہ دینے والا) تسلیم کرنا۔ **ان الحکم الا للہ** ۔ حکم صرف خدا کا واجب الاطاعت ہے۔۔۔ **امر الا تعبدوا الا ایاہ** ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت (اطاعت) اختیار نہ کرو۔

(۶) خدا کو حاکم یا حَکم تسلیم کرنے کا عملی طریق اس کی کتاب کو حَکم تسلیم کرنا ہے۔ (رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے قرآن کریم میں اعلان کرایا گیا کہ) **افغیر اللہ ابتغی حکما و ھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا** (۶/۱۱۵) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حَکم تسلیم کروں' درآں حالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو تمام معاملات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔۔۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کو حَکم ماننے سے خدا کو حَکم مانا جاتا ہے۔

(۷) یہی کتاب کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز ہے۔ **ومن**

لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)۔ جو کتاب خداوندی کو حکم تسلیم نہیں کرتا' تو ایسے ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۸) خود رسولؐ اللہ کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ:

فاحکم بینھم بما انزل اللہ۔ (۵/۴۸)۔

اے رسول! تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔

(۹) یہی دین اللہ ہے۔ (۳/۸۲)۔ اسی کا نام الاسلام ہے۔ یعنی کتاب اللہ کو حکم تسلیم کرنا۔ **ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ۔** (۳/۸۴)۔ جو شخص اس کے سوا کوئی اور دین (نظام) اختیار کرے گا' تو بارگاہ خداوندی میں اسے شرف قبولیت حاصل نہیں ہوگا۔ وہ مردود قرار پائے گا۔

واضح رہے کہ چونکہ خدا نے اسلام کو دین اللہ کہا ہے اس لئے اس کا ترجمہ دین خداوندی ہی کرنا چاہئے خدا کے رسولؐ دین اللہ کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔ خود کوئی دین وضع نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اسلام کو دین مصطفیٰؐ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اسے دین اللہ ہی کہنا چاہئے۔

(۱۰) سوال پیدا ہوگا کہ اس کی پہچان کیا ہوگی کہ ہم میں دین اللہ (یا نظام خداوندی) قائم ہے یا نہیں؟ اس کی اولین پہچان یہ ہے کہ جس قوم میں دین اللہ قائم ہو اس میں مذہبی فرقے نہیں رہ سکتے۔ جہاں مذہبی فرقے ہوں گے نہ وہاں دین اللہ (نظام خداوندی) ہوگا اور نہ ہی ان کے ساتھ رسولؐ اللہ کا کوئی تعلق۔ اس باب میں خدا کا ارشاد نہایت واضح ہے کہ:۔

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شئ (۶/۱۶۰)۔

جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اے رسول! تیرا ان لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رہے گا۔

جو لوگ فرقوں پر قائم رہتے ہوئے ''نظام مصطفیٰؐ'' کے مدعی ہیں' انہیں اس ارشادِ خداوندی پر غور کرنا چاہئے۔ جب (فرمانِ خداوندی کی رو سے) مصطفیٰؐ کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا' تو انہیں ''نظام مصطفیٰؐ'' کے دعوے دار ہونے کا حق کس طرح پہنچ سکتا ہے؟

ملک میں جو لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' ہماری ان سے گذارش ہے کہ وہ ان ارشاداتِ خداوندی پر غور کریں اور سوچیں کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں کا یہ دعویٰ کہ وہ ''نظام مصطفیٰؐ'' (یا اسلامی نظام) قائم کریں گے' کس طرح حق پر مبنی ہوسکتا ہے؟

(طلوع اسلام' ستمبر 1977ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شمیم انور

میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟

(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

محترمہ صدرِ بزم۔۔خواتین وحضرات!

جب سے یہ سوال میرے سامنے آیا ہے کہ ''میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟'' میں سوچ رہی ہوں کہ کیا مجھے اس کا علم بھی ہے کہ ''زندہ رہنے'' سے مفہوم کیا ہے؟ کیا میں کبھی زندہ رہی بھی ہوں' کیا میں اب بھی زندہ ہوں؟ زندگی کے متعلق ایک تصور رکھنا اور بات ہے اور اس تصور کے مطابق زندگی بسر کرنا دوسری بات۔ قرآن کریم نے ہمیں زندگی کا ایک خاص تصور اور اسے ماپنے کا ایک پیمانہ دیا ہے جس کی رو سے' انسانی سطح زندگی اور اس سے نیچے کی مخلوق کی سطح حیات نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہمیں اس کا تو علم ہے کہ قرآن کا عطا کردہ یہ تصور' اور یہ پیمانہ کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم کبھی اس تصور کے مطابق زندہ رہے ہیں اور کیا ہم نے کبھی اپنی زندگی کو اس پیمانے کے مطابق ماپا ہے؟ کیا ہم کبھی انسانی سطح زندگی کی کیفیات سے لذت یاب ہوئے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ کیفِ زندگی سے وہی لذت آشنا ہوسکتا ہے جس نے ان تصورات کے مطابق کبھی زندگی بسر کی ہو۔ اس کا چیلنج یہ ہے کہ

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

لہٰذا' خواتین وحضرات! یہ کہنے کا حق کہ ''میں زندہ ہوں'' صرف اسی کو ہوسکتا ہے جس نے کبھی زندگی کو محسوس کیا ہو۔ اور زندگی کو محسوس وہی کرسکتا ہے جس نے کبھی قرآنی تصور کے مطابق انسان کی سطح پر زندگی بسر کی ہو اور یہی وہ مقام ہے جہاں اصل دشواری پیش آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس سطح پر زندگی کے دن گزارنے کا کبھی تجربہ بھی ہوا ہے؟ اور اگر ایسا تجربہ نہیں ہوا تو پھر میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ ''میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'' ''چاہنے'' کا سوال تو اس کے لئے پیدا ہوسکتا ہے جو جانتا ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

زندگی۔۔اقبال کے الفاظ میں۔۔نفس شماری کا نام نہیں' نفس گدازی کا نام ہے۔ جو نفس گدازی کی لذتوں سے کیف یاب ہی نہیں' اس کا یہ کہنا کہ ''میں زندہ رہنا چاہتا ہوں'' چند سنے سنائے الفاظ کے دہرا دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اسے کہنا چاہئے کہ میں سانس لیتے رہنا چاہتا ہوں۔

پھر خواتین وحضرات! اگر یہ نفس گدازی کی زندگی۔ اگر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کی کیفیات سے لذت گیری' کسی ایک فرد کے بس کی بات ہوتی۔ اگر ہم اسے' باقی افرادِ معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر' اپنی خلوت کی تنہائیوں میں اپنے طور پر حاصل کرسکتے' تو بھی بات کچھ ایسی مشکل نہ ہوتی۔ جو اس ذوقِ بادہ سے لذت آشنا ہونا چاہتا وہ اپنے طور پر اس کے لئے کوشش کر لیتا' لیکن یہ ناممکن ہے۔ ہم دیگر افراد معاشرہ سے الگ رہ کر اس سے کیف اندوز ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم اکیلے بیٹھ کر رو تو سکتے ہیں۔۔ہنس نہیں سکتے۔ اکیلے

بیٹھا ہنسنے والا پاگل نظر آتا ہے۔

لیکن ہمارے موجود معاشرہ میں ہر فرد اکیلا زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہاں صرف افراد بستے ہیں' معاشرہ کا وجود ہی نہیں۔ یہاں ہر مسافر' کارواں سے کٹ کر' اپنے اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ یہاں ہر ایک کی راہ الگ اور ہر ایک کی منزل جدا ہے۔ ہم ان بستیوں میں بس رہے ہیں جہاں کوئی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ ہم میں سے ہر ایک ''غریب شہر'' ہے۔ ہم ایک ایسی ٹیم ہیں جس کا ہر کھلاڑی مختلف سمتوں میں بال کو کک لگاتا ہے۔۔ وہ ٹیم جس کے سامنے کوئی مشترکہ گول نہیں۔ کوئی متحدہ نصب العین نہیں۔۔ ہمارے مفادات' ہماری اقدار' ہماری منزلیں۔۔ سب الگ الگ ہیں۔ ان کا کوئی نقطۂ اتصال ہی نہیں وہ کہیں جا کر ایک دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک' اس قدر انبوہِ کثیر کے اندر رہتا ہوا بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا اور تنہا محسوس کرتا ہے۔۔ ہم' رابنسن کروسو' کی طرح انسانوں کے ایک حدود فراموش سمندر کے اندر اپنے اپنے تصورات کے جزیروں میں تنہا زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم جس دنیا میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں وہ ایک ایسا جیل خانہ ہے' جس کا ہر قیدی' اپنے اپنے ذہن وخیال کی کالی کوٹھڑی میں قیدِ تنہائی کی سزا بھگت رہا ہے۔۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیار

جب قرآن کریم ہمیں ایک مشترکہ منزلِ انسانیت کی طرف آواز دیتا ہے تو ہم اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے شور وشغب میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ اس کی آواز ہمارے دل کی گہرائیوں تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ وہ فضا میں تیرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ ہم اسے یوں سنتے ہیں' جیسے وہ کسی اور کو بلا رہا ہو۔۔!

لیکن اس آواز نے ایک بار ہمارے دل کے تاروں کو ضرور چھوا ہے۔۔ ہم ایک بار زندگی کی کیف باریوں سے لذت یاب ضرور ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک بار ضرور محسوس کیا ہے کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور زندہ کہلانے کے مستحق کون ہیں۔۔ اور یہ کوئی دور کی بات نہیں ابھی کل کی بات ہے جب نور جہاں کی شعلہ صفت آواز میں ملی ترانے کا ایک بول' کروڑوں دلوں میں ارتعاش پیدا کر کے' انہیں یکسر ہم آہنگ کر دیتا' اور جوش نشاط کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا جس سے ہم اس سے پہلے کبھی لذت آشنا نہیں ہوئے تھے' یہ آرزو میرے دل کی گہرائیوں سے بار بار ابھرتی ہے کہ اے کاش! وہ دن کہیں پھر سے لوٹ آئیں! میری اس آرزو کے اظہار پر' کئی چہروں پر استہزاء کی ہنسی پَیر جاتی ہے۔۔ شروع شروع میں' خود مجھے بھی اپنی یہ آرزو کچھ عجیب سی دکھائی دیا کرتی تھی۔۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا کہ چونکہ تم جنگ کی تباہ کاریوں سے براہ راست متاثر نہیں ہوئی ہو' اس لئے تم اس انداز سے سوچتی ہو' ورنہ' جنگ بھی کوئی ایسا تماشا ہے جسے بار بار دیکھنے کی تمنا کی جا سکے؟ ایسا کہا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اب محسوس کرتی ہوں کہ میری یہ آرزو ان لمحات کو پھر سے واپس بلانے کے لئے ہے جن میں دس کروڑ نفوس کے دل کامل ہم آہنگی سے دھڑکتے تھے۔ جب ان کا ردعمل ایک تھا اور اس ردعمل کی شدت ایک جیسی تھی۔ جب وہ ایک آواز پر اٹھتے اور ایک آواز پر بیٹھتے تھے۔۔ جب وہ ایک مقصد کے لئے سوتے اور ایک مقصد کے لئے جاگتے تھے۔ نہیں! جب وہ ایک مقصد کے لئے جیتے اور ایک مقصد کے لئے مرتے تھے۔۔ اف! کس قدر نشاط انگیز تھی کروڑوں دلوں کی یہ ہم آہنگی۔۔ کیسی مسرت خیز تھی لاکھوں سازوں سے نکلنے والی یہ ایک صدا۔۔ کیسی وجد آور تھی یک نگہی و یک رنگی کے ''بتھوون'' کی یہ فردوسِ گوش (Symphony)۔۔ کیسے حسین تھے۔۔ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ۔۔ کے یہ سحر آفریں لمحات!

اب جبکہ وہ صدائیں فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گئی ہیں

میں پھر سے اپنے آپ کو تنہا پاتی' اور اداس محسوس کرتی ہوں۔۔ایک میں ہی نہیں' ساری کی ساری قوم پھر سے اپنے آپ کو تنہا پاتی اور اداس محسوس کرتی ہے' اس لئے کہ یہ پھر سے اپنی اس پہلی زندگی کی طرف لوٹ گئی ہے۔۔ وہی انفرادی مفاد پرستی اور خود غرضی کی زندگی۔۔ وہی ایک دوسرے سے ٹکرانے والی قدروں اور مختلف منزلوں کی طرف لے جانے والے راستوں کی زندگی۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ اس قسم کی یک نگہی اور ہم آہنگی کی زندگی' جنگ کے سے پُر خطر زمانے میں ایسی وجد آور اور طرب انگیز تھی' تو وہ حالتِ امن میں کیسی نشاط آور اور بہار آفریں ہوگی! اے کاش! مجھے وہ اندازِ زیست کہیں مستقل طور پر میسر آجائے۔۔!

لیکن وہ مجھے تنہا کیسے میسر آجائے؟۔۔ وہ تو اسی صورت میں میسر آ سکتا ہے جب' سب کے سب اس انداز کی زندگی بسر کریں اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔۔ ایک نئے نواز اکیلا (Symphony) پیدا نہیں کر سکتا۔۔ اس مجبوری اور بے بسی کی بھی کوئی انتہا ہے؟ اب پھر وہی میں ہوں اور وہی شہرِ خموشاں!! ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے

اب جو یک نگہی اور ہم آہنگی کے وہ حیات بخش لمحات گذر چکے ہیں' معاشرہ میں پھر وہی نفسانفسی شروع ہوگئی ہے۔ اب پھر پہلے کی طرح' ہر سینے میں دل الگ الگ انداز سے دھڑکتا ہے۔۔ بالکل منفرد۔۔ باقی دلوں سے یکسر بیگانہ۔۔ اس کے مقاصد بھی الگ' ان کے حصول کے طریق بھی جداگانہ!

وہ مقصد ہے کیا جس کے لئے اب ہم مصروف تگ و تاز ہیں۔۔؟ ہمارے منصوبے' ہماری اسکیمیں' ہماری کوششیں' ہمارے خدشات' ہماری پریشانی کاہے کے لئے ہیں؟ ہماری تمام سعی و کاوش کا منتہیٰ کیا ہے؟ ہماری تگ و تاز کی منزل کون سی ہے؟۔۔ اس کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے۔ یہ سب' طبیعی زندگی کی ضروریات کے لئے وقف ہیں۔۔ روٹی' کپڑا' مکان۔۔ نفس شماری کی زندگی کے سہارے' حیوانی سطح پر جینے کا سامان۔۔ اب ہماری تمام جدوجہد کا منتہٰی یہی ہے۔۔ ''اس وقت تو کھانے کو مل گیا ہے' کل کو کیا ہوگا'' اس کی فکر ہر ذہن کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ جو کوئی سوچتا ہے تو اسی کے لئے سوچتا ہے۔ جو کوئی کام کرتا ہے تو اسی کے لئے کرتا ہے۔ جو پریشان ہے وہ اسی کی وجہ سے پریشان ہے اور جو خوش ہے تو محض اس لئے کہ اسے یہ کچھ حاصل ہو گیا ہے! ہماری سیاسی' معاشی' معاشرتی زندگی کا سارا تانا بانا انہی خدشات اور انہی خطرات سے بُنا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر کل کو ہمیں کچھ ہو گیا تو ہمیں کھانے کو کہاں سے ملے گا۔ اسی پریشانی کی وجہ سے ہم ہر وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ جمع کر سکیں زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی کر سکیں۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیں۔۔ دوسروں کے حقوق غصب کر لیں۔ ہم اسی جنون میں دوسروں کو اپنے پاؤں تلے روندتے چلے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک فرد دوسرے فرد کے قتل کے درپے ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کی جان کا لیوا ہے۔ ایک مملکت دوسری مملکت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے۔۔ کاہے کے لئے؟ صرف اس لئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس نسبت سے کوئی زیادہ سمیٹتا ہے اسی نسبت سے کوئی دوسرا اور زیادہ محتاج ہو جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ایک طرف وہ طبقہ بڑھتا جا رہا ہے جو رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھا ہے اور دوسری طرف اس انبوہِ کثیر میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو نانِ شبینہ تک کے لئے بھی ان کا محتاج ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود عدم تحفظ۔۔ (Insecurity) کا احساس روز بروز شدید ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اب، خواتین وحضرات! ہماری زندگی کا مقصد اور منتہیٰ یہی رہ گیا ہے۔

زندہ رہنے کی اس مجنونانہ تگ وتاز سے ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے بعض زندہ رہ جائیں۔۔خواہ وہ اس جنگ آزمائی سے کتنے ہی زخمی کیوں نہ ہو چکے ہوں۔۔لیکن سوال پھر وہی سامنے آتا ہے کہ اس جنون آمیز سعی وکاوش کا آخر مقصد کیا ہے؟ ہم کام کرتے ہیں، دن رات کام کرتے ہیں اور کام کرتے کرتے تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔۔ اس سے ہمیں کیا ملتا ہے؟۔۔محض روٹی! ہم پھر دوسرے دن اٹھ کر کام کرنے لگ جاتے ہیں۔کاہے کے لئے؟۔۔ محض اس لئے کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے روٹی مل جائے۔۔ہم دن رات محنت کرتے ہیں۔کس لئے؟ اس لئے کہ ہماری یہ بے مقصد زندگی زیادہ سے زیادہ لمبی ہو جائے۔ ہماری یہ بے مقصدی مستقل ہو جائے۔

بارالٰہا! یہ زندگی کے ساتھ کیا مذاق ہو رہا ہے۔ یہ انسانیت کی کس قدر تذلیل ہے۔ ہماری تمام انسانی صلاحیتیں، استعداد، توانائی، وقت، عقل وخرد، سب روٹی حاصل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ہم سے تو حیوانات ہی اچھے ہیں جنہیں اپنے زندہ رہنے کے لئے کبھی اس قسم کی دردسری نہیں کرنی پڑتی۔ یہ انسان جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے، اپنے غلط نظام زندگی کی بدولت، حیوانوں سے بھی پست تر سطح پر آ چکا ہے۔کیا ایسا ممکن نہیں کہ مجھے، آپ کو اور ہر انسانی بچہ کو، اس کی ضروریات زندگی، بغیر جگر پاش مشقتوں کے، فطرت کے سیدھے سادھے طریق کے مطابق، ازخود ملتی جائیں، اور جہاں اس میں کوئی رکاوٹ پڑے، ہر فرد اسے بطور اپنے بنیادی حق کے طلب اور حاصل کر سکے؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اور آپ کام کریں۔زیادہ سے زیادہ کام کریں۔لیکن اس لئے کہ ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ ہم کام کرنے پر مجبور ہیں، اس ڈر کے مارے کہ اگر کام نہ کیا تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔محض روٹی کی خاطر زندہ رہنا، زندگی نہیں کہلا سکتا۔۔زندگی یہ ہے کہ انسان، کام کرنے کے لئے خود اپنے آپ پر تو پابندیاں عائد کرے، کوئی دوسرا اس پر پابندی عائد نہ کرے۔انسان اور حیوان میں یہی تو فرق ہے۔حیوان دوسروں کی منشاء کے مطابق کام کرتا ہے۔کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے انسان اپنے اختیار وارادہ سے کام کرتا ہے۔سوچئے کہ اس کام میں کس قدر لذت اور حسن ہوگا جسے ہم بھوک کے اس بھیڑیئے کے خوف کی وجہ سے نہ کریں جو ہر وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا ہے۔۔لیکن ہم اس لذت کو کیا جانیں۔۔ اس لذت سے ہم میں سے کوئی بھی آشنا نہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اس بھیڑیئے کے خوف سے مامون نہیں۔۔اگر انسان کو فکرِ معاش سے آزاد اور مطمئن کر دیا جائے تو اس کی جس قدر بے پناہ مضمر صلاحیتیں، بلند تخلیقی مقاصد کے لئے فارغ ہو جائیں گی ان کا آج اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ایک بلند مقصد کے لئے، دل کے پورے لگاؤ اور اطمینان کے ساتھ مصروفِ کار ہو جانے کے نتائج کس قدر درخشندہ ہوں گے اور اس سے خود کام کرنے والے کی صلاحیتوں کی کس قدر نشوونما ہوتی جائے گی۔۔ میں بجالاتِ موجودہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔لیکن بایں ہمہ، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں لیکن صرف روٹی کی خاطر نہیں۔۔ میں کام کرنا چاہتی ہوں لیکن حصولِ معاش کے لئے نہیں۔۔لیکن موجودہ معاشرہ میں اس کی فکر کس کو ہے کہ یہ دیکھتا پھرے کہ کون تخلیقی مقاصد کی خاطر کام کرتا یا کرنا چاہتا ہے جبکہ زندگی کا مقصد محض حفاظتِ خویش۔۔ (Self-Preservation) اور افزائشِ نسل (Procreation) رہ گیا ہو۔ جب مقصدِ حیات محض تولید رہ جائے تو تخلیق کا کسے خیال ہوسکتا ہے؟

(ماخوذ طلوعِ اسلام، مئی 1966ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایاز حسین انصاری

دینی مدارس کی خامیاں

ہم تسلیم نہیں کرتے

محترم (مولانا) فضل الرحمٰن سیکریٹری جنرل متحدہ مجلس عمل اور جمیعت علمائے اسلام کے امیر نے کہا ہے کہ:

''دینی مدارس اسلام کے قلعے اور علم نبوت کی چھاؤنیاں ہیں ان کا کردار قیامت تک جاری رہے گا..... انہیں ختم کرنے کی کوشش کرنے والی قوتیں خود ختم ہو جائیں گی۔''

یہ اظہار انہوں نے بدھ اور جمعرات (مورخہ 7 رجب المرجب 1424ھ) کے درمیانی شب جامعہ احسن العلوم گلشن اقبال میں علماء کنونشن سے خطاب کے دوران کیا۔ (بحوالہ جنگ کراچی' مورخہ 5-9-2003)۔

محترم فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے دعاوی کی صداقت کے لئے کوئی ثبوت نہیں دیا۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ بیان ان مذہبی مدارس کا تقدس عوام کے دل میں راسخ کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ جو حقائق پر مبنی نہیں۔

مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق' فلسفہ' معانی' بیان ادب' نحو وغیرہ کی تفصیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ منطق اور فلسفہ بھی وہ جو اب عہد پارینہ کی داستان بن چکا ہے۔ اس نصاب ہیئت' ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان کے نصاب میں قرآن کریم بھی داخل نہیں۔ تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ہے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ہیں اور آخری سال سورہ بقرہ (کے صرف ابتدائی پانچ رکوع) تفسیر بیضاوی داخلِ نصاب ہیں۔ بس اس نصاب کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے۔

ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے۔ ختم نبوت تحریک کے سلسلہ میں' فسادات پنجاب کی تحقیقات کمیٹی (جسے جسٹس منیر کمیٹی کہا جاتا ہے نے) مختلف علماء کرام سے پوچھا کہ ''مسلمان کسے کہتے ہیں؟'' اس سوال کے جواب بعض نے تو کہہ دیا کہ سوال کا جواب دو چار فقروں میں دیا نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے صفحات درصفحات درکار ہوں گے۔ جنہوں نے جواب دیا' ان کے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

ان علماء میں سے کسی دو کے جواب بھی ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے (انگریزی رپورٹ۔ص ۲۱۸)۔

اسلام نے اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہ راست قوانین خداوندی کی اطاعت کر سکتا ہے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو گیا اور یوں استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

یہ مدارس جنہیں آج کل دینی مدارس کے نام سے پکارا جاتا ہے درحقیقت مذہبی مدارس ہیں جو مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لئے ہوئے ہیں۔ انہیں دینی مدارس کی بجائے مذہبی مدارس کہہ کر پکارا جانا چاہئے۔ دین کے اندر مذہبی پیشوائیت کی گنجائش ہی نہیں۔ مذہبی مدارس کے حقائق عوام سے گہرائی سے چھپائے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے مذہبی پیشوائیت ہے ہی معاشی مسئلہ۔ ان کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے تو یہ اپنے لئے ایک وقت کی روٹی بھی کما نہیں سکتے۔ یہ لاکھوں بے کار انسانوں کا انبوہ جن کا ملکی پیداوار میں کوئی حصہ نہیں لیکن دراصل یہ حضرات محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ ملک کی تباہی کا باعث ہے۔

اس سلسلہ میں بعض نامور علماء حضرات کی آراء سے کچھ اقتباسات شہادت کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

مدت ہوئی کہ سید مودودی (مرحوم) بانیء تحریک جماعت اسلامی کو ایک کالج کے جلسے میں خطبہ دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس موقع پر آپ نے جو کچھ فرمایا تھا ان کے چند اقتباس پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''کیا یہ واقع نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لئے نہیں بلکہ اس کی غارتگری کے لئے تیار کرتا ہے؟ ان درسگاہوں میں.....آپ کو اسلام کے فلسفے اسلام کی اساسِ حکمت' اسلام کے اصول معیشت' اسلام کے اصول قانون' اسلام کے نظریۂ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طرز پر سوچنے لگتے ہیں' غیر اسلامی نقطہ نظر سے زندگی کے ہر معاملہ کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں' کیوں کہ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں۔ منتشر طور پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں' مگر وہ غیر مستند اور بسا اوقات غلط اوہام و خرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں۔ ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے زیادہ بعید ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہوگا اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا اور جو لوگ اس عقیدت

سے بھی خالی ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ عملاً جو تربیت آپ کو میسر آتی ہے، جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں، اور عملی زندگی کے جن نمونوں سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے ان میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیریکٹر اور اسلامی طرز عمل کا نشان پایا جاتا ہے، اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ علمی حیثیت سے اسلام کی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہو، نہ عملی حیثیت سے اسلامی تربیت دی گئی ہو، وہ فرشتے تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اٹھیں، ان پر وحی تو نازل نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علم دین ڈال دیا جائے۔ وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی شان رکھتے ہیں تو یہ ان کا قصور نہیں بلکہ ان درسگاہوں کا قصور ہے جو موجودہ نظام تعلیم کے تحت قائم کی گئی گئی ہیں..... ان درسگاہوں میں دراصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے، اور اس ملت کی قبر کھودی جاتی ہے''۔

(تعلیمات مجموعہ مضامین ابوالاعلیٰ مودودی شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور طبع اول ۱۹۵۵ء، ص ۶۲ تا ص ۶۴)۔

''جہاں تک ہمارے پرانے نظام تعلیم کا تعلق ہے وہ آج سے صدیوں پہلے کی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس وقت یہاں انگریزی حکومت آئی اور .....وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے تو اس پورے نظام تعلیم کی افادیت ختم ہو گئی۔ اس نظام تعلیم سے نکلے ہوئے لوگوں کے لئے نئے دور کی مملکت میں کوئی جگہ نہیں رہی۔..... تاہم چونکہ اس کے اندر ہماری صدیوں کی قومی میراث موجود تھی اور ہماری مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی اس کے اندر کچھ نہ کچھ سامان موجود تھا۔ (اگرچہ کافی نہ تھا) اس لئے اس زمانے میں ہماری قوم کے ایک اچھے خاصے بڑے عنصر نے یہ محسوس کیا کہ اس نظام کو جس طرح بھی ہو سکے قائم رکھا جائے تاکہ ہم اپنی آبائی میراث سے بالکل منقطع نہ ہو جائیں۔.....ایسی غرض کے لئے انہوں نے اس کو جوں کا توں قائم رکھا۔ لیکن جتنے جتنے حالات بدلتے گئے اتنی ہی زیادہ اس کی افادیت گھٹتی چلی گئی، کیونکہ اس نظام تعلیم کے تحت جو لوگ تعلیم پا کر نکلے ان کو وقت کی زندگی اور اسکے مسائل سے کوئی مناسبت ہی نہ رہی۔ اب جو لوگ اس نظام تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔ اس طرح ان کی ذات سے اگرچہ کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ہمیں پہنچتا ہے.....لیکن اس فائدے کے مقابلے میں جو نقصان ان سے ہم کو پہنچ رہا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں، نہ ان

کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی اس میں کچھ کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بُعد بڑھتا جا رہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آ رہی ہے۔ پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا' کیونکہ ان کی ضروریات زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سرے سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔..... آج ہم غنیمت سمجھ کر اسی کو اپنی دینی تعلیم سمجھتے ہیں' لیکن حقیقت میں اس کے اندر دینی تعلیم کا عنصر بہت کم ہے۔ کوئی عربی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کے نصاب تعلیم میں پورا قرآن مجید داخل ہو۔ صرف ایک یا دو سورتیں (سورۂ بقرہ یا سورۂ آل عمران) باقاعدہ درساً درساً پڑھائی جاتی ہیں۔ باقی سارا قرآن اگر کہیں شامل درس ہے بھی تو صرف اس کا ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ تحقیقی مطالعۂ قرآن کسی مدرسے کے نصاب میں بھی شامل نہیں۔ یہی صورت حال حدیث کی ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ تعلیم جیسی کہ ہونی چاہئے' جیسی کہ محدث بننے کے لئے درکار ہے' کہیں نہیں دی جاتی۔ درس حدیث کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے وہ یہ ہے کہ جب فقہی اور اعتقادی جھگڑوں سے متعلق کوئی حدیث آ جاتی ہے تو اس پر دو دو تین تین دن صرف کر دیے جاتے ہیں۔ باقی رہیں وہ حدیثیں جو دین کی حقیقت سمجھاتی ہیں' یا جن میں اسلام کا معاشی اور سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی نظام بیان کیا گیا ہے' یا جن میں دستور مملکت' یا نظام عدالت' یا بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہے' ان پر سے استاد اور شاگرد دونوں اس طرح رواں دواں گزر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی بات قابل توجہ ہے ہی نہیں۔ حدیث اور قرآن کی بہ نسبت ان کی توجہ فقہ کی طرف زیادہ ہے' لیکن اس میں زیادہ تر بلکہ تمام تر جزئیات فقہ کی تفصیلات ہی توجہات کا مرکز رہتی ہیں۔ فقہ کی تاریخ' اس کے تدریجی ارتقاء' اس کے مختلف اسکولوں کی امتیازی خصوصیات' ان اسکولوں کے متفق علیہ اور مختلف فیہ اصول' اور ائمہ مجتہدین کے طریق استنباط' جن کے جانے بغیر کوئی شخص حقیقت میں فقیہ نہیں بن سکتا' ان کے درس میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں' بلکہ ان چیزوں پر شاگرد تو درکنار استاد بھی نگاہ نہیں رکھتے۔

اس طرح یہ نظام تعلیم ہماری ان مذہبی ضروریات کے لئے بھی سخت ناکافی ہے جن کی خاطر اسکو باقی رکھا گیا تھا۔ رہیں دنیوی ضروریات تو ان سے تو اس کو سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔'' (تعلیمات مجموعہ مضامین ابوالاعلیٰ مودودی شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ' لاہور طبع

اول ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۸ تا ص ۱۴۲)۔

''دوسری چیز جو ہمیں اپنے نظام تعلیم میں بطور اصول کے پیش نظر رکھنی چاہئے اور اسی کی بنیاد پر ہمارا سارا نظام تعلیم بننا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہم اس دین اور دنیا کی تفریق کو ختم کر دیں۔ دین اور دنیا کی تفریق کا تخیل ایک عیسائی تخیل ہے، یا بدھ مذہب یا ہندوؤں اور جوگیوں کا ہے۔ اسلام کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں، اپنے نظام تمدن میں اور اپنے نظام مملکت میں اس دین اور دنیا کی تفریق کے تخیل کو قبول کر لیں۔ ہم اس کے بالکل قائل نہیں ہیں کہ ہماری ایک تعلیم دنیوی ہو اور ایک تعلیم دینی۔ اس کے برعکس ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری پوری کی پوری تعلیم بیک وقت دینی بھی ہو اور دنیوی بھی۔ دنیوی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو سمجھیں اور دنیا کے کام چلانے کے قابل ہوں۔ اور دینی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو دین ہی کے نقطۂ نظر سے سمجھیں اور دین کی ہدایت کے مطابق اس کا سارا کام چلائیں۔ اسلام وہ مذہب نہیں ہے جو آپ سے یہ کہتا ہو کہ دنیا کے کام آپ جس طرح چاہیں چلاتے رہیں اور بس اس کے ساتھ چند عقائد اور عبادات کا ضمیمہ لگائے رہیں۔ اسلام زندگی کا محض ایک ضمیمہ بننے پر نہ کبھی قانع تھا اور نہ آج ہے۔ .....اس قسم کا ایک دین کیسے یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ آپ کے ہاں ایک تعلیم دنیوی ہو اور دوسری دینی، یا ایک دنیوی تعلیم کے ساتھ محض ایک مذہبی ضمیمہ لگا دیا جائے۔ وہ تو یہ چاہتا ہی کہ آپ کی پوری تعلیم دینی نقطۂ نظر سے ہو۔ اگر آپ فلسفہ پڑھیں تو دینی نقطۂ نظر سے پڑھیں تا کہ آپ ایک مسلمان فلاسفر بن سکیں۔ آپ تاریخ پڑھیں تو ایک مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے پڑھیں تا کہ آپ ایک مسلمان مؤرخ بن سکیں۔ آپ سائنس پڑھیں تو ایک مسلم سائنٹسٹ بن کر اٹھیں۔ آپ معاشیات پڑھیں تو اس قابل بنیں کہ اپنے ملک کے پورے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ آپ سیاسیات پڑھیں تو اس لائق بنیں کہ اپنے ملک کا نظام حکومت اسلام کے اصولوں پر چلا سکیں۔ آپ قانون پڑھیں تو اسلام کے معیار عدل و انصاف پر معاملات کے فیصلے کرنے کے لائق ہوں۔ اس طرح اسلام دین و دنیا کی تفریق مٹا کر پوری کی پوری تعلیم کو دینی بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کسی جداگانہ مذہبی نظام تعلیم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کے یہی کالج آپ کے لئے امام اور مفتی اور علمائے دین بھی تیار کریں گے۔ اور آپ کی قومی حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لئے سیکریٹری اور ڈائریکٹر بھی۔'' (تعلیمات مجموعہ مضامین ابوالاعلیٰ مودودی شائع کردہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ، لاہور طبع اول ۱۹۵۵ء، ص ۱۵۵ تا ص ۱۵۷)۔

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) جو امام الہند کے لقب سے پکارے جاتے تھے وہ اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ'' میں ارشاد فرماتے ہیں:

''مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت

اسلامیہ کے تمام مفاسد کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ سارے برگ و بار و ثمراتِ فساد کا انہیں سے ظہور رونما ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم، باسمِ اصل واساس علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل وتفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر ان کا شریعت اصلیہ اور دین خالص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت اور عجمیت سے؟ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علوم الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم وہیئات معاشرت و غیر ذالک۔ جب یہ حال علم شرعیہ مکتبہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر واوہام کا کیا پوچھنا، جن کو بہ لقبِ شریف ''معقولات'' پکارا جاتا ہے۔ وان من العلم جھلا۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''ان کا سرمایۂ ناز علمِ حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر جدل وخلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات اور تیز کرتی رہتی ہے۔'' (تذکرہ، صفحہ ۸۳۔۸۴)۔

دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے شائع ہونے والا مجلّہ ''معارف'' (جس کے مدیر سید سلیمان ندوی مرحوم تھے (مذہبی دنیا میں بڑے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ستمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں تحریر تھا:

''واقعہ یہ ہے کہ ہم مولویوں، جن کا خطاب میر باقر داماد کی ''الافق المبین'' کے الفاظ میں ''لم لا یکونیون'' اور ''لا نسلمیون'' بھی ہے یعنی لم یکون کذا (ایسا کیوں نہیں ہوسکتا) اور لا نسلمیون (ہم یہ تسلیم نہیں کرتے) یہ دو حربے ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں کہ جب تک جس مسئلہ کے متعلق جو جی میں آئے ہم کہتے چلے جاسکتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم مدرسہ والوں کے درمیان کسی بدقسمت آدمی کی کوئی بات جا پڑے۔ جنگلوں کے درخت اور گھاس، جن سے کاغذ تیار کئے جاتے ہیں، شاید کانپ اٹھتے ہوں۔ جب ان کو خبر ملتی ہو کہ مولویوں نے ''آستینیں'' ''لم لا یکون کذا'' اور ''لا نسلم'' کہنے کے لئے چڑھائی ہیں۔ سمندر بھی تھرا اٹھیں کہ ان کا پانی بھی ہم مولویوں کے لم لا یکونیات اور لا نسلمیات کی سیاہی کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ (کذا)''۔

اس وقت ملک میں تعلیم کے دو مراکز ہیں۔ ایک مذہبی مدرسے اور دارالعلوم جن میں طالب علموں کو ''دنیا'' سے بیگانہ رکھا جاتا ہے اور دوسرے ہمارے اسکول اور کالج، جن میں طلباء دین سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہ ہیں تعلیم کے دو الگ الگ دوائر جن کا نتیجہ ''دین اور دنیا'' میں وہ بُعد و تضاد اور عدم اعتماد و انتشار ہے۔ اس بُعد اور ثنویت (Dualism) کی ذمہ دار خود ہماری حکومت ہے۔ وہ ایک طرف مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کی اس قدر

حوصلہ افزائی اور امداد کرتی ہے کہ ان کا دائرہ اثر ونفوذ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دوسری طرف، ہمارے اسکول اور کالج ہیں، جن کا نصاب تعلیم ایسا ہے جس سے طالب علم، دین کی غایت وحقیقت سے یکسر بیگانہ رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو کچھ انہیں اسلام کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے، دین سے جاذبیت پیدا ہونے کی بجائے، ان کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام مسلسل چلا رہا ہے کہ ملک سے، تعلیم کی اس دوعملی کو ختم کیا جائے۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کو بند کر دیا جائے اور اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے نصاب میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ طالب علم، علوم دنیاوی کے ساتھ ساتھ دین کی اصل وحقیقت سے بھی آشنا ہوتے چلے جائیں اور اس طرح وہ اپنی ارضی زندگی کو سماوی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کر کے، صحیح اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کر سکیں۔ دوسری طرف، قوم کو اس انتشار وخلفشار سے نجات مل جائے جو مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں سے وبا کی طرح پھوٹ کر ملک کے امن کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام نے مسلسل ومتواتر حکومت کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن حکومت نے اس سے بے اعتنائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں متنفر ہو رہا ہے اور مذہب پرست طبقہ وہ پوزیشن حاصل کئے جا رہا ہے جو ازمنہ مظلمہ میں، یورپ میں، احتساب (Inquisition) کے علمبردار، پادریوں نے حاصل کر لی تھی اور جس کے بعد، عیسائیت کو وہاں کی عملی زندگی سے دیس نکالا مل گیا تھا۔

طلوع اسلام نے مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں، محترم صدر مملکت کی خصوصی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی تھی کہ ملک کے نظام تعلیم میں جو، دوعملی پائی جاتی ہے۔ وہ دو عملی جس کی رو سے مذہبی تعلیم مکتبوں اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے اور ''دنیاوی'' تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں۔۔۔ اس سے قوم کی زندگی میں وہ ثنویت پیدا ہو رہی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس سے پاکستان کی سالمیت مخدوش ہو رہی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تو بنیاد ہی اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رو سے ''دین اور سیاست'' میں کوئی بُعد نہیں یہ دونوں ایک ہیں۔ طلوع اسلام نے گزارش کیا تھا کہ حکومت اس ثنویت کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدام کرے۔

صدر صاحب نے جو حالیہ آرڈیننس نافذ کیا ہے یہ مبارک اقدام ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ ایک عظیم انقلابی اقدام ہے جس کے لئے ملک گیر جدید نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ:

(i) ملک میں صرف اسکول اور کالج رہیں۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوم بند کر دیئے جائیں۔

(ii) نصاب تعلیم میں الگ اسلامیات کا شعبہ نہیں رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس الگ شعبہ سے پھر وہی ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ (یہ ''اسلامیات'' کیا ہے اور اس کے نتائج کیا۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے کبھی پھر لکھیں گے)۔

(iii) نصاب تعلیم ایسا ہو کہ طلباء کو جو مضمون بھی پڑھایا جائے، اس میں بتایا جائے کہ قرآن کریم اس باب میں کیا تعلیم دیتا ہے اور اس کے ماحصل کو کس طرح اسلام کی پیش کردہ مستقل اقدار انسانیت کے تابع رکھا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی انہیں روزمرہ

کی زندگی میں ان امور سے روشناس کرا دیا جائے جن کی سرانجام دہی کے لئے آج کل ایک الگ مولوی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

(iv) اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں کی تعلیم لاء کالج میں دی جائے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے' نظام تعلیم کی یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں' یہ بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ اس لئے اس کے لئے بڑے عزم' ہمت' محنت اور تدبر کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر یہاں یہ تبدیلی پیدا ہوگئی تو ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کو عالم اسلام ہی میں نہیں' اقوام عالم میں ممتاز ترین مقام حاصل ہو جائے گا۔ اسلئے کہ:

(۱) جس قوم میں مذہبی پیشوائیت موثر ہوگی وہ قوم کبھی مقام آدمیت تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اور

(۲) جو قوم خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار سے بے بہرہ رہے گی۔ اسے انسانیت کی سطح نصیب نہیں ہو سکے گی۔

''دین اور دنیا'' کی تعلیم کے ادغام سے مراد یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کر کے' قوم کے نوجوان طبقہ کو مستقل اقدار خداوندی سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے یہ صحیح مقام انسانیت تک پہنچ سکیں گے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کی طرف تدریجاً بڑھتے چلے جانا چاہئے۔ واللہ المستعان۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوجوانوں کا طبقہ کسی ملک اور قوم کا طغرہ (Crast) ہوتا ہے جس سے وہ قوم پہچانی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قوموں کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں' ان کے گرم خون کی حرارتیں' ان کا زور بازو' ان کا جوش کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی تخلیق ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی طبقہ تھا جسے طلوع اسلام نے اپنے تصورات کی آماجگاہ' اپنی امیدوں کا مرکز' اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی کو اپنے پیغامات انقلاب آفریں کا درخور تخاطب سمجھا اور انہی کے لئے عصر حاضر کے مفکر پرویز صاحب اقبال ہی کے الفاظ میں دعا مانگتے رہے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

طلوع اسلام پاکستان کے اندر مسلسل مرض کی نشاندہی کرتا چلا آ رہا ہے کہ ان بیچاروں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس کے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیتے جائیے۔ تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیم کے لئے طلوع اسلام نے یہ حل پیش کیا کہ پاکستان کے اندر ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جن کی تعلیم کا محور خدا کی کتاب یعنی قرآن حکیم ہو اور یہ درسگاہیں ایسے طالب علم تیار کریں کہ:

(۱) پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔

(۲) اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہئے اور قوانین کس قسم کے۔

(۳) افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہوسکتا ہے۔

(۴) وہ کونسی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے۔

(۵) دنیا کی مختلف قومیں س وقت جن معاشرتی، سیاسی، قومی، بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں ملتا جس کی وجہ سے امن عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے قرآن حکیم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

(۶) اس درس گاہ کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نکتۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کرسکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی رہنمائی کرسکیں۔

(۷) ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال پیش کر سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرت نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ رکھ لیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

طلوع اسلام نے جو فکر پیش کی ہے اس کے متعلق پاکستان کے ممتاز قانون دان اور سابق وحدت مغربی پاکستان کے چیف جسٹس جناب اے۔آر۔کیانی (مرحوم) نے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا:

''تعلیمی درس گاہوں کے پیش نظر یہی نہیں ہونا چاہئے کہ طالب علم ایک معینہ مدت کے بعد صرف اسناد ہی لے کر فارغ ہوں بلکہ وہ اسناد کے ساتھ ان درس گاہوں سے انسان بن کر بھی نکلیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طلباء ان درسگاہوں سے انسان بن کر نکلیں، تو ان درسگاہوں کے اندر آپ کو لامحالہ اس فکر کو اپنانا ہوگا جو ''طلوع اسلام'' نے پیش کی ہے۔''

طلوع اسلام کہتا ہے کہ ملت کی کشتِ ویراں کا نم اس آب نشاط انگیز سے حاصل ہوتا ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کے مقرر کردہ حدود و قیود ہی وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے اندر یہ انقلاب صحیح تعلیم کی رو سے لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان بچوں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ ان کی گزرگاہوں کو وہ ساحل مہیا کر دیئے جائیں جن کی بنیاد ان قوانین پر ہو جو قرآن حکیم کی دفتین میں موجود ہے۔ جنہیں کہیں باہر سے Import کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ملک و قوم کی یہ عظیم متاع محفوظ ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجوزہ تعلیمی درسگاہیں ایسی درسگاہیں بن جائیں گی جو ان درسگاہوں سے مختلف ہوں گی جن کے متعلق اکبر نے کہا تھا۔

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ہم صدر محترم اور وزیراعظم محترم کی خدمت میں بصد ادب گزارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں فکر بلند اور قلب حساس کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہاں آپ کو مملکت کے وسیع ترین اختیارات بھی حاصل ہیں۔ آپ اگر ان تینوں چیزوں کو یکجا کر کے، تھوڑی سی ہمت کر لیں تو آپ یقیناً اسلام کو اس تاسف انگیز انجام سے بچا سکتے ہیں، جو انجام عیسائیت کا ہوا ہے۔ اس سے آپ کا نام اس دنیا میں بھی تاریخ کے اوراق پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا اور آخرت میں بھی اسلام، آگے بڑھ کر، آپ پر تہنیت و تبریک کے پھول نچھاور کرے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالؔی مرحوم)

اَلدِّیْنُ یُسْرٌ

(زیرِنظر مضمون، رسالہ تہذیب الاخلاق میں ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حالؔی نے بتایا یہ ہے کہ وہ دین جو خدا کی طرف سے ملا تھا، سیدھا سادہ اور آسان تھا۔ اس میں ''نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی گئی تھی نہ عبادات میں کوئی ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا جو ناقابلِ برداشت ہو۔'' لیکن اس کے بعد اس دین پر ''حاشیے چڑھائے گئے۔'' اور ان عناصر کو بھی دین کا جزو بنا دیا گیا جنہیں دین سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ اس طرح یہ صاف اور سادہ دین، عجیب گورکھ دھندا سا بن گیا۔ ان حاشیوں میں پہلا حاشیہ یہ تھا کہ نبی اکرمؐ نے جو امور محض عرب کی معاشرت کے لحاظ سے اختیار کئے تھے (مثلاً رہنے سہنے کا طریق وغیرہ) انہیں بھی ناقابلِ تغیر شریعت قرار دے دیا گیا۔ دوسرا حاشیہ یہ تھا کہ دین کی روح پر نگاہ رکھنے کے بجائے رسوم و آداب کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ جس کی وجہ سے یہ نظام زندگی بننے کے بجائے میکانکی طریق عمل بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے چار اور حاشیوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم اس مضمون کی ابتداء تیسرے حاشیے سے کرتے ہیں اور حواشی اور غیر ضروری حصوں کو حذف کر کے، باقی مضمون آخیر تک شائع کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام)

وضعی حدیثیں

تیسرا حاشیہ: واعظوں کی نادانی اور صوفیوں کی سادہ لوحی یا خود غرضوں کی بددیانتی سے اس پاک دین پر چڑھا۔ انہوں نے اعمال ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا تعصب کے جوش میں کسی دنیوی غرض کے پورا کرنے کے لئے سینکڑوں اور ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور رفتہ رفتہ یہ سراسر جعلی اور بناوٹی احادیث بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار پا گئیں۔ اگرچہ محققین نے ان کی تحقیقات اور چھان بین کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کی موضوعات اور مفتریات کو احادیث صحیحہ سے جہاں تک ہو سکا جدا کیا مگر ان کی جرح و قدح صرف کتابوں ہی تک محدود رہی اور واعظوں کے رنگین فقرے جو کم سے کم ہزار برس تک وعظ کی بھری مجلسوں میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر چلتے رہے وہ مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک وباء کی طرح پھیل گئے۔

علماء کی ایک بڑی جماعت (جیسا کہ جامع الاصول اور شرح نخبۃ الفکر وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے) اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ ترغیب اور ترہیب کے ذریعہ حدیثیں وضع کرنی یا ضعیف اور منکر حدیثوں کی روایت کرنی جائز ہے۔

اسی بناء پر بے شمار حدیثیں ترغیب کے لئے وضع کی گئیں۔ مثلاً مؤذنوں کے فضائل میں ایسا مبالغہ کیا گیا کہ ان کے مراتب سے بڑھ کر انسان کے لئے ولو کان نبیا او اماما کوئی درجہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''موذن کے لئے ہر شے جس کو اس کی اذان کی آواز پہنچی ہے پتھر ہو یا درخت یا ڈھیلا یا خشک یا تر قیامت کے دن سب ہی گواہی دیں گے اور اس مسجد کے تمام نمازیوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا۔'' یا یہ حدیث کہ قیامت کے دن سونے کی کرسیاں لائی جائیں گی جن میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے ہوں گے اور سندس اور استبرق کے فرش پر بچھائی جائیں گی۔ پھر ان پر نور کے سائبان لگائے جائیں گے اور پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں مؤذن تا کہ ان پر آ کر بیٹھیں۔'' یا مثلاً مسجد کی خدمت کرنے والوں کے فضائل میں جیسے:

''جس نے مسجد میں چراغ روشن کیا جب تک وہ چراغ روشن ہے اس کے لئے فرشتے اور حاملانِ عرش برابر استغفار کرتے رہتے ہیں۔''

''جس نے مسجد میں قندیل لٹکائی یا بوریا بچھایا اس پر ستر فرشتے برابر درود بھیجتے ہیں جب تک وہ قندیل نہیں بجھتی یا وہ بوریا نہیں ٹوٹتا۔''

''جس نے خدا کے کسی گھر میں جھاڑو دی اس نے گویا چار سو حج کئے اور چار سو بردے آزاد کئے۔ چار سو روزے رکھے اور چار سو جہاد کئے۔''

یا مثلاً حفظۃ القرآن کے فضائل میں جیسے یہ حدیث کہ حافظِ قرآن کی فضیلت غیر حافظ پر ایسی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر''۔ اسی طرح سینکڑوں روزے اور ہزاروں نمازیں اور بے انتہا طواف اور بے شمار صدقے وضع کئے اور ان کے اجر اور ثواب کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا۔

ترہیب وتخویف کے لئے بھی ایسے ہی مبالغے کے ساتھ حدیثیں وضع کی گئیں۔ مثلاً

''جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔''

''مسجد کے ہمسائے کی نماز مسجد کے سوا کہیں نہیں ہوتی۔''

''جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے خدا اس کے تمام اعمالِ حسنہ کو ضائع کر دیتا ہے۔''

''جس نے بے نماز کی مدد ایک لقمے سے کی۔ اس نے گویا تمام نبیوں کے قتل میں اعانت کی۔''

بہت سی حدیثیں اپنے اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لئے بنائی گئیں۔ مثلاً

''جس نے نماز میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے۔''

''جس نے رکوع میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے۔''

جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے جبریل سے پوچھا کہ نحر سے کیا مراد ہے۔ کہا یہ مراد ہے کہ جب نماز کی نیت باندھو تو پہلی تکبیر پر اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرو۔

بہت سی حدیثیں تعصب یا تنفر کی وجہ سے بنائی گئیں جیسے امام شافعیؒ اور امام اعظمؒ کی مدح یا ذم میں یا جیسے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کی مدح یا ذم میں مثلاً یہ حدیثیں:

''خدا کے نزدیک تین امین ہیں۔ میں۔ جبریل۔ اور

معاویہ''۔

''ہر امت کے لئے ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے۔''

''ایک بار آنحضرتؐ نے جبریل سے ہاتھ ملانا چاہا۔ جبرئیلؑ نے ہاتھ ملانے سے انکار کیا۔ آپ نے سبب پوچھا۔ کہا۔ تم نے ایک یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا اور جو ہاتھ کافر کے ہاتھ سے مس کرے میں اس سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔''

''جو شخص یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرے اس کو اپنا ہاتھ دھونا اور وضو کر لینا چاہئے۔''

امام ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جن کے راس و رئیس وہب بن وہب اور قاضی بختری وغیرہ تیرہ آدمی ہیں۔

انہی تیرہ آدمیوں میں سے ایک محمد بن عکاسہ کرمانی ہے جس نے محمد بن تمیم فاریانی کی شرکت میں دس ہزار حدیثوں سے زیادہ وضع کی ہیں۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ جن کی حدیثوں میں وضع اور کذب وغیرہ کے آثار پائے جاتے ہیں وہ کئی قسم کے لوگ ہیں۔

پہلا گروہ: بعضے تارکِ دنیا ہیں جنہوں نے حدیث کی نگہداشت سے غفلت کی۔

دوسرا گروہ: بعضوں کی تحریریں ضائع ہوگئیں اور انہوں نے اپنی یاد کے بھروسہ پر غلط روایتیں کر دیں۔

تیسرا گروہ: بعضے ثقات بھی ہیں جو بڑھاپے میں آ کر خرف ہو گئے۔

چوتھا گروہ: بعضوں نے سہو سے غلط روایت کی اور جب اپنی غلطی سے خبردار ہوئے تو ان کو صحیح روایت کرنے سے شرم آئی۔

پانچواں گروہ: بعضے زندیق اور ملحد ہیں جنہوں نے شریعت میں رخنہ اور خرابی ڈالنے کے لئے عمداً اور جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں۔ حماد بن زید نے کہا ہے کہ ''زنادقہ نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔'' جس وقت ابن ابی العوجاء کو وضعِ حدیث کے جرم میں قتل کرنے لگے تو اس نے اقرار کیا کہ ''میں نے تمہارے دین میں چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا ہے۔

چھٹا گروہ: بعضے ایسے بھی تھے جو ثواب و اجر کی امید پر ترغیب و ترہیب کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے۔ گویا ان کے نزدیک شریعت ناقص تھی جس کی تکمیل کی ضرورت تھی۔

ساتواں گروہ: بعضوں نے اپنے مذہب کی تائید میں جعلی احادیث بنائیں۔ چنانچہ اہل بدعت میں سے ایک شخص تائب ہوا تو اس نے کہا کہ حدیث کے لینے میں احتیاط کرو اور دیکھا کرو کہ کس شخص سے حدیث لیتے ہو۔ ہمارا مدت تک یہ حال رہا کہ جس بات کو چاہا حدیث نبوی کے پیرایہ میں بیان کر دیا۔

آٹھواں گروہ: بعضوں نے یہ ٹھہرالیا تھا کہ جس کا کوئی عمدہ قول ہاتھ لگے۔ اس میں اسناد اپنی طرف سے شامل کر دیجئے اور نبی تک اسناد کو پہنچا دیجئے۔

نواں گروہ: بعضوں نے سلاطین و ملوک کو خوش کرنے اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے یہ شیوہ اختیار کیا تھا۔

دسواں گروہ: بعضے قصہ گو اور واعظ تھے جو لوگوں کو حسن بیان پر فریفتہ کرنے کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے اور کتب صحاح میں اس قسم کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ انتہیٰ۔

اس کے سوا اور بھی اسباب وضع و افترا کے بیان کئے ہیں۔ من شاء فلیرجع الی الفوائد المجموعة لمحمد بن الشوکانی۔

تفسیریں

چوتھا حاشیہ: یہ چڑھا کر مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف و منکر حدیثیں بھر دیں اور یہ قابل نفریں کام انہوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔

صحابہؓ تابعینؒ تبع تابعین و من بعد ہم کے اقوال بلا ذکر اسناد بحسب ضرورت اپنی اپنی تفسیروں کی تقویت کے لئے حدیث نبوی کے پیرائے میں نقل کر دیئے گئے۔

یہودیوں سے سنے سنائے لاانتہا جھوٹے اور بے بنیاد قصے تفسیروں میں بھر دیئے گئے۔

بہت سے مسائل اصول و فروع کے قرآن شریف کی عبارات و اشارات سے محض اپنی رائے اور قیاس کے موافق استنباط کئے گئے۔ نہ اس کی تائید کے لئے کوئی حدیث صحیح نقل کی اور نہ کسی صحابی اور تابعی کا قول لکھا۔

جن موجودات علوی و سفلی کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے ان کے حقائق کی تشریح ارسطو اور بطلیموس اور دیگر فلاسفۂ یونان کے موافق کی گئی۔

متکلمین نے مخالف فرقوں کو الزام دینے اور اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے صدہا آیتوں کی تفسیریں اپنی مرضی کے موافق کیں اور آیات قرآنی کو کھینچ تان کر کہیں سے کہیں لے گئے اور یہ تمام کوڑا کرکٹ اصل دین میں داخل سمجھا گیا اور وحی سماوی کی طرح واجب التسلیم خیال کیا گیا۔

شرح جامع صغیر میں علامہ ابن کمال سے نقل کیا گیا ہے کہ ''تفسیر کی کتابیں موضوع حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔''

اسی طرح مفسرین کے قصص و اخبار کی نسبت ابوالامداد ابراہیم نے قضاء الوطر حاشیہ نخبۃ الفکر میں اور ملا علی قاری نے شرح لشرح نخبۃ الفکر میں اور علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں تصریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام قصے اہل کتاب کے ہاں سے لئے گئے۔ اصل یہ ہے کہ فتح شام میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اہل کتاب کی بہت سی کتابیں بہ قدر ایک بار شتر کے ہاتھ لگی تھیں۔ سو جو باتیں ان سے بکثرت منقول ہیں وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہل کتاب کی ہیں اور اسی طرح بہت سی روایتیں حضرت عبداللہ بن سلام سے بھی اسی قسم کی مروی ہیں۔ پھر مفسرین کے دوسرے طبقہ میں مجاہد اور تیسرے طبقہ میں مقاتل بن سلیمان اور ان کے سوا اور لوگوں نے صدہا قصے اہل کتاب سے اخذ کئے ہیں۔

علم الکلام: متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے اس پاک دین پر پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار دیا گیا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جب مصر۔ شام۔ یونان اور قبرص وغیرہ سے فلسفے کی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور ان کے ترجمے عربی زبان میں ہونے شروع ہوئے اور فلاسفہ کے مختلف

خیالات اوران کی مختلف رائیں جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات اور حاکم کی حقیقت سے علاقہ رکھتی تھیں علمائے اسلام میں شائع ہوئیں تو فلسفے کی چکنی چپڑی اور دلفریب دلیلوں کے آگے مذہب کی عظمت آہستہ آہستہ دلوں میں کم ہونے لگی۔ کیونکہ حکماء کے مقالات بظاہر موجہ اور مدلل دکھائی دیتے تھے اور مذہبی تعلیمات محض حسنِ عقیدت یا وجدانی شہادت سے تسلیم کی گئی تھیں۔

دوسرے اہل نفاق کے شبہے آنحضرت صلعم کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اسلام میں شک اور تردد کا بیج بو چکے تھے۔

پس دین کے ہوا خواہوں نے اس بات کی ضرورت دیکھی کہ فلسفہ یونانی کے مقابلے میں ایک دوسرا فلسفہ مرتب کیا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کی تائید فلسفی دلیلوں سے کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ جیسا کہ انسان کی طبیعت کا مقتضاء ہے اس جدید فلسفہ میں صدہا مباحث ضرورت سے زیادہ بڑھا دیئے گئے اور خوب دل کھول کر معرکہ آرائیاں کی گئیں۔ چونکہ یہ کام کسی جماعت یا کمیٹی نے مل کر نہیں کیا تھا بلکہ جدا جدا طبع آزمائیاں ہوئی تھیں اس لئے ضروری تھا کہ ان کی رایوں میں بے شمار اختلافات واقع ہوں۔ پس اس طرح دین اسلام میں بے شمار فرقے بن گئے۔ مگر علماء نے کھینچ تان کر ان لاانتہا جماعتوں کو تہتر فرقوں میں محدود کر دیا تا کہ حدیث ستفترق امتی ثلثة و سبعین فرقة کلهم فی النار الا واحدة کی سچائی میں کچھ فرق نہ آئے۔ اگرچہ ان تہتر فرقوں میں سے معدود فرقوں کے سوا (جیسے اشاعرہ یا شیعہ یا ان کی چند شاخیں) کوئی فرقہ اب دنیا میں نہیں پایا جاتا مگر صدہا اور ہزارہا کتابیں ان کے مناظروں اور مباحثوں سے بھری ہوئی اب تک موجود ہیں اور وہ تمام علم کلام کے نام سے مشہور ہیں۔

علم کلام کی ان کتابوں میں جن مطالب کی تفصیل درج ہے ان کا جاننا اور سمجھنا اور یقین کرنا ایسا ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان کے بغیر اسلام معتبر اور صحیح نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اشاعرہ کے ہاں جو آج کل ''اہل سنت والجماعت'' کے نام سے مشہور ہیں ان باتوں کا انکار کرنا کہ صفات باری تعالیٰ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔ نہ لاعین نہ لاغیر۔ یا یہ کہ خدا تعالیٰ اگر تمام نیک بندوں کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دے اور تمام شریروں کو ہمیشہ کے لئے جنت میں بھیج دے تو اس کی طرف حیف ومیل کی نسبت نہیں ہوسکتی یا یہ کہ خلفاء کی فضیلت ایک دوسرے پر خلافت کی ترتیب کے موافق ہے۔ یعنی ہر خلیفۂ سابق خلیفۂ لاحق سے افضل ہے' بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبوت یا معاد کا انکار کرنا۔ اگر کوئی شخص مثلاً رویت بصری کو محال قرار دے اور حدیث نبوی جو رویت بصری پر دلالت کرتی ہے اس کی تاویل کرے یا حضرت علی مرتضیٰؓ کو شیخین کے برابر یا ان سے افضل سمجھے وہ فوراً جماعت اہل سنت سے باہر ہو جاتا ہے اور ان فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی نسبت کلهم فی النار کہا گیا ہے۔ شرح مواقف اور شرح مقاصد اور امام رازیؒ کی اکثر مبسوط کتابیں جو علم کلام میں ہیں اور صواعق محرقہ اور صواقع کابلی اور تحفہ اور منتہیٰ الکلام اور ازالۃ الغین اور اس قسم کی ہر کتاب اور ہر رسالہ جو علم کلام میں اشاعرہ کی تائید کے لئے لکھا گیا ہو یا لکھا جائے سب اول سے آخر تک واجب التسلیم سمجھے گئے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا ہے وہ مبتدع سمجھا جاتا ہے۔

تقلید

چھٹا حاشیہ: تقلید و بدعات اور رسوم کا ایک طویل الذیل حاشیہ ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ یہ حاشیہ اصل دین سے بھی

زیادہ عزیز ہوگیا ہے۔

تقلید نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتب سابقہ کی طرح منسوخ کر دیا ہے۔

کتاب اللہ سوائے اس کے کسی کام کی چیز نہیں رہی کہ:۔

ذرا ذرا سے بچے اسے مکتبوں میں طوطے کی طرح پڑھیں یا بڑے ہو کر اس کی تلاوت محض لفظی طور پر کریں یا ختموں اور عرسوں میں اس کی چند آیتیں یا سورتیں مناقب کے ساتھ پڑھی جائیں یا نئے مردوں کی قبروں پر اس کا ایک آدھ ختم کرایا جائے یا رمضان کی تراویح میں اکتا اکتا کر اور پچھتا پچھتا کر اس کا ایک ختم وہ لوگ سنیں جو اس کا ایک حرف نہیں سمجھتے۔

سنت رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی حال ہے کہ اول تو اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے والے روز بروز صفحۂ ہستی سے محو ہوتے جاتے ہیں اور اگر چند نفوس متبرکہ باقی ہیں ان کا لے دے کے یہ کام ہے کہ صحاح کے اول و آخر کے چند صفحے تبرکاً و تمیناً شاگرد کو سرسری طور پر پڑھا دیئے اور اس کو علم حدیث کی سند لکھ دی۔ شاگرد اور استاد دونوں کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی ضرورت کے وقت ہم کو ان حدیثوں سے کچھ کام پڑے گا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کوئی فتویٰ اور کسی مسئلے کا جواب اس وقت تک مقبول نہیں ہوسکتا جب تک قاضی خان اور عالمگیری یا بحر الرائق وغیرہ کی عبارت اس میں درج نہ کی جائے۔ گویا قرآن اور حدیث کے مخاطب صحیح تمام امت میں چند آدمی تھے جو ان کا لب لباب نکال کر کتب فقہ میں درج کر گئے۔ اب کتاب وسنت معاذ اللہ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں۔

من ز قرآں مغز را برد اشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

رسوم و بدعات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی اسلام کی رگ و پے میں بیٹھ گئی ہیں ان کا دین سے جدا کرنا اور گوشت کا ناخن سے جدا کرنا برابر ہے۔ دو پلڑی ٹوپی۔ پردہ دار انگرکھا۔ ڈھیلا یا تنگ مہری کا پائجامہ۔ نوکدار جوتی۔ زمین پر بیٹھ کر کھانا اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں مسلمانوں نے قطعاً غیر قوموں سے سیکھی ہیں۔ بیاہ شادی کی اکثر رسوم ہندوستان میں آ کر انہوں نے تعلیم پائی ہیں مگر وہ اس قدر عزیز اور ضروری ہوگئی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے خلاف کرتا یا کہتا ہے تو وہ ''کرسٹان'' کا خطاب پاتا ہے۔

یہاں ہم کو رسوم و بدعات کا مفصل بیان کرنا منظور نہیں ہے بلکہ مجمل طور پر صرف یہ جتانا ہے کہ دین اسلام پر جو فضول اور لغو حواشی چڑھے ہوئے ہیں ان میں سے سب سے بڑا حاشیہ تقلید اور رسوم و بدعات کا ہے۔ موقع اور فرصت ہوئی تو کسی دوسرے وقت یہ بحث کسی قدر تفصیل سے لکھی جائے گی۔

یہ تمام حواشی جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان کے سوا اور بھی بہت سے حاشیے اس سیدھے سادے دین پر چڑھے ہوئے ہیں جو تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علمائے دین دوشِ اسلام کو اس ناگوار بوجھ سے ہلکا کرنے میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی عظمت اور بزرگی اسی میں جانتے ہیں کہ وہ روز بروز اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار ہوتا چلا جائے شاید پچھلی صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا بھی گذرا ہو جس میں امت کے لئے شریعت کا دائرہ تنگ کرنا قرین مصلحت سمجھا گیا ہو اور انسان کے حق میں خدا اور رسول کی تکلیفیں ناکافی خیال کی گئی ہوں اور اس کی بہبودی اسی میں تصور کی گئی ہو کہ وہ کسی حالت میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے۔ مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

آج ہم کو نہ صرف دنیوی عزت حاصل کرنے کے لئے

بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ دین محمدیؐ کی شان وشوکت دنیا میں قائم رہے اور امت محمدیہؐ اپنے ہمعصروں کی نظر میں حد سے زیادہ حقیر وذلیل نہ ہوجائے اس قدر کام درپیش ہیں کہ خالص دین کے سوا دیگر تکلفات کا تحمل ہم میں باقی نہیں ہے۔ اسلام پر حاشیے چڑھتے چڑھتے جو صورت اب اس کی ہوگئی ہے اگر اسی کو اسلام سمجھا جائے تو عن قریب کسی مسلمان کو ضروریات دین سے اس قدر مہلت نہ ملے گی کہ وہ نہایت ذلت وخواری سے دونوں وقت قوت لایموت بہم پہنچا کر بری بھلی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر لے چہ جائیکہ وہ دنیا میں عزت سے رہ سکے یا دین کی کچھ شان وشوکت بڑھا سکے۔ جس عالم میں ہم کو اب اور آئندہ رہنا ہے۔ اس میں ادنیٰ درجے کی عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے وہ تدبیریں درکار ہیں جو پہلے شاید ملک اور سلطنت ہی کے لئے درکار تھیں کیونکہ ترقی انسان کا زمانہ اس قوم کے حق میں سخت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے جو اس زمانہ کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کے برخلاف اپنے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کرے۔

خالص اسلام: ہم کو دین کی شان وشوکت قائم رکھنے کے لئے بھی ضرور ہے کہ صرف خالص اسلام کی حمایت کریں اور اس کو حشو وزواید سے پاک کر کے تمام عالم کو دکھا دیں کہ صرف اسلام ہی دنیا میں ایسا دین ہے جو انسان کی خوشی اور آزادی کو ترقی دینے والا ہے۔

یورپ کے بڑے بڑے محققوں نے جو اسلام کی نسبت نہایت عمدہ عمدہ رائیں لکھی ہیں اس سے ان کی کمال تحقیق اور تنقیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے جیسا کہ ان تصنیفات سے ظاہر ہے اس سارے مجموعہ کو اسلام نہیں سمجھا جس پر اب اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنی نہایت گہری نگاہ سے اس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کر کے ٹھیٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور طرف اسی پر اپنی اپنی رائیں لکھی ہیں۔ اگر وہ اس تمام مجموعہ کو جس کو ہمارے بھائی مسلمان اسلام سمجھتے ہیں ٹھیٹ اسلام جان کر اسی پر رائے لکھ بیٹھتے تو ان کی راستی اور انصاف ہرگز ایسی رائیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا۔ جو مسلمان اس زمانہ کے موافق تعلیم پا رہے ہیں یا آئندہ پائیں گے وہ جب ہی تک اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں کہ اس تمام مجموعہ کو اسلام نہ سمجھیں۔ اگر بدنصیبی سے انہوں نے بھی اسی کو دین اسلام سمجھا تو عیاذاً باللہ ان غریبوں کی نوبت الحاد وارتداد تک پہنچ جائے گی اور اسکا مظلمہ ان مولویوں اور عالموں کی گردن پر ہوگا جو اسی مہیب اور ڈراؤنی اور وحشت انگیز صورت پر اسلام کا رہنا پسند کرتے ہیں۔

ہم جو دنیا کے تمام ادیان اور ملل میں سے صرف دین اسلام ہی کو واجب التسلیم سمجھتے ہیں اور اس کے سوا اور دینوں کو ایسا نہیں جانتے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے نہیں ہیں کیونکہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے کہ ان من امة الا خلا فیها نذیر۔ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گذرا ہو۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ منهم من لم نقصص علیک یعنی ہم نے بعض انبیاء کا حال تجھ پر (اے نبی آخرالزماں) ظاہر نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے کہ جو اوپر مذکور ہوئی اور دینوں پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ اس سبب سے دیتے ہیں کہ جس وقت دین اسلام کا ظہور ہوا اس وقت ادیان سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا تھا اور انسان کی افراط وتفریط سے حق اور باطل مل جل کر ایک ہو گئے تھے۔ شرک وبدعت نے توحید اور سنن راشدہ کو دبا لیا تھا اور خودغرض عالموں کی تحریفات اور مقلد جاہلوں کی جہالت اور متعصب دین داروں کے غلو سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر حق کو باطل سے جدا کیا اور جو کھوٹ اور ملاوٹ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اس کو دور کر کے ایک خالص کندن نکالا اور اسی کا نام اسلام رکھا۔

اب اگر اسلام بھی شرائع سابقہ کی طرح اپنی اصلیت پر باقی نہ رہے تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ''ہمارا دین حق ہے اور باقی ادیان ایسے نہیں ہیں۔'' فقط۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

الہام

مجلّہ فیض الاسلام، راولپنڈی میں محترم سید جعفر شاہ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''وحی سے ہمارا تعلق۔'' محترم شاہ صاحب نے یہ مضمون اشاعت سے پہلے، ازراہِ نوازش، مجھے دیکھنے کے لئے ارسال فرمایا تھا۔ مضمون محنت اور کاوش سے لکھا گیا تھا لیکن مجھے اس کے بعض مقامات سے اختلاف تھا جن کی طرف میں نے اپنے خط میں محترم شاہ صاحب کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ آیا الہام کی کوئی دینی حیثیت بھی ہے۔ محترم شاہ صاحب نے میرے عریضہ کا جواب بھی مرحمت فرمایا تھا لیکن اس سے میرا اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک یہ سوال ایسا اہم ہے جس پر ذرا تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

محترم شاہ صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے تین چیزیں عطا ہوئی تھیں۔

(۱) وحی
(۲) الہام۔ اور
(۳) بصیرت

وحی اور الہام میں انہوں نے فرق یہ بتایا تھا کہ وحی میں مفہوم کے ساتھ الفاظ بھی منزل من اللہ ہوتے ہیں لیکن الہام میں صرف مفہوم خدا کی طرف سے القا کیا جاتا ہے جسے پیغمبر اپنے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ الہام کے متعلق مزید ارشاد تھا کہ وہ اولیاء اللہ کو بھی عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ تھے:

> اس طرح کے مجرد خیالات عام انسانوں کے دماغ میں ڈالے جاتے ہیں۔ اولیائے مقربین کے دماغوں میں بھی القا کئے جاتے ہیں اور انبیائے مرسلین کے قلوب مطہر پر بھی الہام کئے جاتے ہیں اور وحی کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے۔ اس وحی میں ایک پیغمبر اس طرح ایک ولی کی سطح پر ہوتا ہے جس طرح ایک ولی تکوین وحی میں مگس شہد کی سطح پر ہوتا ہے لیکن اس اشتراک کے باوجود جس طرح ایک ولی مگس سے ایک بلند تر وحی کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پیغمبر اولیاء سے ایک بالاتر وحی کا بھی مہبط ہوتا ہے..... یہ (بالاتر) وحی کسی غیر نبی، کسی ولی اور کسی دوسرے مقرب پر نہیں ہوتی۔ وہی وہ فصل ہے جو ایک پیغمبر کو دوسرے اصحاب وحی سے ممتاز کرتی ہے..... اسی کو ماانزل اللہ کہا جاتا ہے۔ ماانزل اللہ اور الہام کا سب سے بڑا قرآنی فرق یہ ہے کہ ہر الہام کا دوسروں تک پہنچانا (تبلیغ و ابلاغ) ضروری نہیں۔ اس کا بلاغ نہ فرائض ولایت میں ہے نہ فرائضِ رسالت میں داخل ہے..... اس غیر ملفوظ وحی (الہام) کو مانے بغیر چارہ کار نہیں۔

اس وحی غیر ملفوظ (الہام) کی ضرورت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> احادیث تنزیل نہیں بلکہ یا تو الہام نبوی ہیں یا بصیرت بشری۔ عقل و فہم سے بڑا درجہ ہے فراست کا اور فراست سے بڑا درجہ ہے بصیرت

کا۔ الہام کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں عقل' فراست اور بصیرت کسی کی رسائی نہ ہو۔ احادیث میں الہام نبوی کا حصہ بہت تھوڑا ہے اور معاملات میں تو بہت ہی شاذ ہے۔ عقائد سب کے سب مکمل طور پر تنزیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مناسک کا (جسے عام طور پر عبادات کہتے ہیں) البتہ الہام سے زیادہ تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اخلاق کا تعلق زیادہ تر اور اکثر و بیشتر بصیرت ہی سے ہے۔ باقی رہے معاملات۔ سو حدود' ان کی بھی تنزیل ہی نے بتادی ہے لیکن ان کی تفصیلات کا تعلق سراسر عقل و بصیرت سے ہے۔

یعنی شاہ صاحب کے خیال کے مطابق

(۱) عقائد سب کے سب وحی خداوندی ہیں۔

(۲) اخلاق کا تعلق پیغمبرانہ فراست سے ہے۔

(۳) معاملات کی ''حدود'' منزل من اللہ ہیں لیکن ان کی جزئیات کا تعلق عقل و بصیرت سے ہے۔

(۴) عبادات کی تفاصیل کا تعین الہام کے ذریعے کیا گیا ہے۔

یہ اس لئے کہ محترم شاہ صاحب کے الفاظ میں

عقائد گھڑی گھڑی بدلنے والی حقیقت نہیں جو ہر موقعہ پر ترمیم و اضافہ کرنے کے لئے صرف حدود کھینچ دی جائیں اور ضرورت کے مطابق شکل و صورت مختلف ہوسکتی ہے اور بعض مجبوری کے مواقع پر زمان و مکان اور طریق ادا وغیرہ میں ردوبدل کی بھی ضرورت ممکن ہے۔ اس لئے اس کے اصول و ارکانِ ضرور یہ تو تنزیل ہی سے متعلق ہیں لیکن کچھ تفصیلات کا تعلق الہام سے ہے اور بعض جزئیات کا تعلق بصیرت و عقل سے بھی ہے۔

اخلاق کی قدریں بھی غیر متبدل ہیں اس لئے تنزیل ہی نے اسے بھی مکمل کر دیا ہے۔ اگر ضرورت داعیہ کچھ جزئی تفصیلات کا مطالبہ کرے تو اس کے لئے الہام کی ضرورت نہیں۔ بصیرت کافی ہے۔

جہاں تک معاملات کا تعلق ہے ان کی حدود تنزیل نے اپنے ذمے لے لی ہیں اور جزئی تفصیل کو بصیرت ہی پر چھوڑ دیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک عقائد' اخلاق اور معاملات کا تعلق ہے' محترم شاہ صاحب میرے اس مسلک سے متفق ہیں جسے میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں۔ البتہ ''عبادات'' کے متعلق ان کا خیال ہے کہ جو تفاصیل قرآن نے متعین نہیں کیں' انہیں رسول اللہ ﷺ نے بذریعہ الہام متعین فرما دیا تھا۔ یعنی وحی غیر محفوظ کی رو سے۔ اتنے حصے میں محترم شاہ صاحب ان حضرات سے متفق ہیں جو وحی کی دو قسمیں تسلیم کرتے ہیں۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو اس باب میں شاہ صاحب اور وہ حضرات ایک ہی مسلک کے پیرو ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ حضرات اخلاق' معاملات اور عبادات' سب کو وحی غیر متلو کے دائرہ کے اندر تصور کرتے ہیں لیکن شاہ صاحب اس وحی (الہام) کا دائرہ صرف عبادات تک محدود قرار دیتے ہیں۔ گویا اصولاً دونوں متفق ہیں۔ فرق صرف تفصیل اطلاق میں ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہاں تک بھی فرماتے ہیں کہ:

> اس الہامی وحی کو اگر حضورؐ نے مثلہٗ معہٗ یعنی مثل تنزیل مع تنزیل فرما دیا ہو تو اس پر حیرت و استعجاب کے اظہار کی خاص ضرورت نہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ چکی ہوگی کہ ''الہامی وحی'' وہی کچھ ہے جسے عام طور پر ''وحی غیر متلو'' یا ''وحی خفی'' کہا جاتا ہے۔ وحی غیر متلو کے متعلق طلوع اسلام کے صفحات پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کے بعد ''وحی الہامی'' کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن چونکہ محترم شاہ صاحب نے الہام کا ذکر چھیڑ کر اس میں اولیاء اللہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس لئے الہام کے متعلق گفتگو ضروری معلوم ہوئی کیونکہ اس سے پہلے' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' اس عنوان پر طلوع اسلام میں کچھ نہیں لکھا گیا (اگرچہ معارف القرآن کی دوسری جلد میں وحی کے عنوان کے ذیل میں اس کے متعلق بحث آ چکی ہے)۔

میں نے اپنے خط میں محترم شاہ صاحب کو اس باب میں لکھا تھا:۔ 1

(۱) اب رہ گیا الہام۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں انبیاء اور اولیاء دونوں شامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کے لئے قرآنی سند درکار ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کوئی ایسی چیز ہے جسے الہام کہتے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اس الہام کی اتباع بھی ایمان لانے والوں پر واجب ہوتی ہے' اسی طرح جس طرح وحی کی اتباع واجب ہوتی ہے۔ اگر الہام کی اتباع بھی واجب ہوتی ہے تو یہ دین کا جزو ٹھہرا۔

(۲) اس لئے اسے' دین کے جزو اول (وحی) کی طرح یقینی طور پر محفوظ شکل میں امت کے پاس ہونا چاہئے اور اگر اس الہام کی اتباع واجب نہیں ہوتی تو اس کی حیثیت دین کی نہ رہی۔ لہٰذا اس صورت میں یہ بات خارج از بحث ہوگی کہ الہام کی نوعیت کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا؟

(۳) اگر اس کی حیثیت دین کی ہوتی ہے تو پھر یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ اولیاء کے الہام کی حیثیت بھی دین کی ہونی چاہئے۔ کیونکہ آپ کے خیال کے مطابق الہام میں انبیاء اور اولیاء دونوں شریک ہوتے ہیں اور دونوں کے الہام کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو امت کے لئے ہر ولی کے الہام پر ایمان لانا اور اس کی اتباع کرنا بھی جزو دین قرار پا جائے گا۔

اس کے جواب میں محترم شاہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا:۔

(۱) قرآنی سند۔ حضرت یوکبدؑ (حضرت موسیٰ کی والدہ ماجدہ) پر خدا ہی کی طرف سے وحی الہامی ہوئی تھی۔ واوحینا الی ام موسیٰ۔ اور ظاہر ہے کہ یوکبدؑ نبیہ نہ تھیں۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ بھی قبل از نبوت یہی ہوا تھا۔ 2 اتنی سند وحی الہامی کے لئے کافی ہے اور وحی تنزیل کی طرح اس کا دروازہ بند ہونے کی کوئی سند نہیں۔

(۲) الہام کی حفاظت۔ ایسی وحی (جو محفوظ کر لی گئی ہو) صرف قرآن میں محفوظ ہے اور اسی کو ہم نے تنزیلی وحی کہا ہے۔ الہامی وحی کو تسلیم کر لینے سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ 3 الہامی وحی کو بھی ہم نے زیادہ سے زیادہ فقط عبادات و مناسک میں منحصر کیا ہے۔ وہ بھی فقط اپنے رجحان کے اظہار کے طور پر 4..... معاملات کو خارج از الہام ثابت کرنے کے لئے اتنے مواد موجود ہیں کہ متخاصم کا ٹھہرنا قریباً ناممکن ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہی مورچہ فتح کرنا ہے۔ 5

(۳) اتباع الہام۔ انبیاء اور اولیاء دونوں کے الہامی وحی کا سرچشمہ ایک ہونے کے باوجود اس کی حیثیت اتباع میں یقیناً فرق رہے گا۔ اس لئے کہ نبی کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہے لیکن کسی ولی کی ولایت پر ایمان لانا کوئی جزو دین نہیں۔ مسٹر لیاقت علی خاں اگر قانون پاکستان کے مطابق کوئی حکم دیں تو آپ کو ماننا پڑے گا لیکن اگر وہی حکم علامہ سید سلیمان ندوی دیں تو آپ ماننے پر مجبور نہیں ہوں گے حالانکہ دونوں کا حکم یکساں اور دونوں حکموں کا سرچشمہ ایک ہی کتاب آئین ہوگا۔ 6 یہ ایک الگ چیز ہے کہ رسول کا کوئی حکم الہامی نہ ہو یا اگر ہو تو کسی شخصیت یا کسی زمان و مکان کے ساتھ مختص ہو یا قابل تاویل ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تھا محترم شاہ صاحب کا وہ جواب جس سے میں مطمئن نہ ہو سکا تھا۔ میرا سوال یہ تھا کہ:

(۱) کیا قرآن کی رو سے الہام کی کوئی دینی حیثیت ہے۔

(۲) کیا رسول اللہ ﷺ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے کوئی اور وحی بھی ملی تھی جسے ''الہامی وحی'' کہا گیا ہے۔ اگر ملی تھی اور اس کی حیثیت دین کی تھی تو اسے بھی وحی تنزیل کی طرح محفوظ کیوں نہ رکھا گیا۔

(۳) کیا اولیاء کرام کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ اگر ہوتا ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

آیئے۔ ان سوالات کے متعلق ہم دیکھیں کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ اس لئے کہ دین کے متعلق جو کچھ پوچھنا ہو اس سے پوچھنا چاہئے جس نے ہمیں دین عطا کیا ہے۔ دین' اللہ نے دیا ہے۔ اس لئے ہمیں اس باب میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اللہ نے جو کچھ کہنا تھا وہ قرآن میں کہہ دیا۔ اس لئے ہمیں دین کے متعلق ہر باب

میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ میرا یہی مسلک ہے اور آرزو یہی ہے کہ میں یہی مسلک لے کر اللہ کے سامنے جاؤں۔

☆☆☆☆☆☆☆

الہام: الہام لھـم سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا نگل لینا ہے۔ الھم کے معنی ہیں کسی شے کا کسی کے اندر ڈال دینا۔

الہام کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ الھـم کا لفظ ایک مقام پر آیا ہے جہاں فرمایا:

ونفس وما سوھا۔ فالھمھا فجورھا و تقوھا۔ (۹۱/۷۔۶)۔

نفس انسانی اور وہ قوتیں جو اسے درست رکھتی ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر متشتت ہو کر برباد ہو جانے اور قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہو کر نشو ونما پا لینے کی امکانی قوتیں رکھ دی ہیں۔

یہ آیات جلیلہ میرے متعدد مضامین میں اتنی مرتبہ دہرائی جا چکی ہیں کہ اس مقام پر ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ الھمھا کے لفظ کے کیا معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''خدا نے نفس انسان کے اندر یہ امکانی قوتیں رکھ دیں۔'' عام طور پر اس کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ ''اللہ نے نفس انسانی کو نیکی اور بدی کا علم دے دیا۔'' میں اپنے ایک مضمون میں بتا چکا ہوں کہ یہ معنی بہ وجوہ درست نہیں۔ لیکن اس وقت اس نکتہ کے متعلق بحث نہیں۔ اگر اس کے معنی یہ بھی لیئے جائیں تو بھی یہ آیت اس بات کی سند نہیں قرار پا سکتی کہ اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کرام یا اولیاء مقربین کو الہام کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس آیت میں ''نفس انسانی'' کے الہام کا ذکر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں۔ چہ جائیکہ عام مومن اور انبیاء اور اولیاء کی تخصیص ہو۔ لہٰذا یہ آیت مقصد پیش نظر کے لئے مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔

قرآن میں صرف اسی ایک مقام پر الہام کا ذکر ہے اور اس مقام سے ظاہر ہے کہ یہ وہ الہام نہیں جو حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف کیا جاتا ہو۔ قرآن کی رو سے براہ راست بحث تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے الہام کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن دوسرے انداز سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام اور غیر انبیاء کو الہام ہوتا ہے۔ محترم شاہ صاحب نے اپنے دعوے کو ثبوت میں یہی دلیل پیش کی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بعض مقامات پر وحی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کے معنی وہ وحی نہیں جو حضرات انبیاء کرام کی طرف نازل ہوتی ہے بلکہ اس کے معنی الہام کے ہیں۔ اب آیئے اس دلیل کی طرف۔

وحی: لفظ وحی کے معنی ہیں ''خفیف لیکن بہت تیز اشارہ''۔ قرآن میں یہ لفظ اشارے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت زکریاؑ کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہے:

فخرج علیٰ قومه من المحراب فاوحیٰ الیهم (۱۹/۱۰)۔

وہ محراب سے اپنی قوم کی طرف آیا اور انہیں اشارے سے کہا......۔

دوسرے مقام پر خبیث فطرت انسانوں کی باہمی خفیہ سازشوں اور اشارات و کنایات سے گفتگوؤں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وان الشیٰطین لیوحون الی اولیاء هم (۶/۱۲۱ نیز ۶/۱۱۲)۔

اور شیاطین اپنے دوستوں سے اشاروں میں خفیہ سازشوں کی باتیں کرتے ہیں۔

جس قانون کی رو سے آفاقی کائنات کا نظم و نسق جاری ہے اس کے

لئے بھی وحی کا لفظ آیا ہے۔

اوحیٰ فی کل سماء امرھا (۴۱/۱۱)۔

اللہ نے ہر سماء میں اپنا امر وحی کر دیا۔

زمین کے متعلق ہے کہ وہ اپنے ''اثقال'' نکال باہر کرے گی۔

بان ربک اوحیٰ لھا (زلزلت)۔

کیونکہ تیرا رب اسے اس کی وحی کرے گا۔

شہد کی مکھی کے متعلق بھی ہے کہ خدا نے اسے وحی کی (اوحیٰ ربک الی النحل۔سورہ نحل) کہ وہ کس طرح اپنا چھتہ بنائے اور اسے شہد سے بھر دے۔

جنگ بدر کے سلسلہ میں ملائکہ کے متعلق فرمایا کہ:

اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتو الذین امنوا.....(۸/۱۱)۔

جب تیرے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔تم جماعت مومنین کو ثابت قدم رکھنا۔

ان مقامات میں وحی کے معنی امرِ الٰہی کے ہیں۔کائنات اور نوامیسِ فطرت میں امرِ الٰہی (امر تکوینی) کس طرح نفاذ پذیر ہوتا ہے ہم اسے نہیں جان سکتے۔ یہ خدا کا قانون ہے جس کی رو سے کارگہ فطرت اس حسن وخوبی سے چل رہا ہے۔ہم اس قانون کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے نتائج کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔لیکن یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے اس راز کو نہیں پا سکتے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وحی کے متعلق اب دوسری قسم کی مثالیں لیجئے۔ ان آیات میں اس وحی کا ذکر ہے جو خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کی طرف نازل کی جاتی تھی۔ یہ صرف خاصۂ نبوت تھا اور کوئی غیر از نبی اس میں قطعاً شریک نہ تھا۔

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح..... الخ (۴/۱۶۳)۔

یقیناً ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نے نوحؑ کی طرف اور دوسرے انبیاء کی طرف جو اس کے بعد آئے وحی بھیجی تھی۔ اور وحی بھیجی تھی ابراہیمؑ کی طرف اور اسمٰعیلؑ کی طرف اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد کی طرف اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف۔اور داؤدؑ کو ہم نے زبور عطا کی تھی.....

اس وحی کی خصوصیت یہ تھی کہ خود رسول اس کی اتباع کرتا تھا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے۔

اتبع ما یوحی الیک (۱۰/۱۰)۔

اور جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو۔

اور اسی وحی کی رو سے نبی اکرمؐ نوع انسانی کو غلط نظام زندگی کے نتائج اور عواقب سے آگاہ کرتے تھے۔

قل انما انذرکم بالوحی (۲۱/۴۲)۔

ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں صرف وحی خداوندی کی رو سے آگاہ کرتا ہوں۔

اسی وحی کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔

واوحی الی ھذا القران لا نذرکم بہ ومن بلغ۔ (۶/۱۹)۔

اور تیری طرف اس قرآن کو وحی کیا گیا ہے تا کہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور ان تمام انسانوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے آگاہ کروں۔

حضورؐ کی حیثیتِ رسالت اسی وحی قرآنی کی رو سے تھی۔اس کے علاوہ باقی حیثیت بشری تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الٰہ واحد۔(۱۸/۱۰۹)۔

ان سے کہہ دو کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔اس امتیاز کے ساتھ کہ میری طرف وحی ہوتی ہے کہ تمہارا الٰہ فقط اللہ واحد ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ وحی قرآن کے اندر ہے اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے۔لہٰذا یہی وہ ملفوظ اور

محفوظ وحی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی طرف نازل ہوئی اور جس کی اتباع ہر مومن پر لازم ہے۔ یہ یقینی ہے، ظنی نہیں۔ حق ہے، باطل اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ یہی دین ہے اور یہی اللہ کی طرف سے حجت اور سند۔ اس وحی کی کنہ و حقیقت کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ یہ خاصۂ نبوت ہے اور مقام نبوت، حیطۂ ادراک سے ماورا ہے۔ معلوم نہیں اس کا نزول انبیائے کرام کی طرف کس طرح ہوتا تھا۔ نبی کے علاوہ کوئی انسان اس حقیقت سے باخبر نہیں ہوسکتا اور اب چونکہ نبوت بھی ختم ہو چکی ہے اس لئے ہم وحی کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اور ہمارے لئے زندگی کا ضابطہ۔ قوانین فطرت کی طرح اس کی صداقت بھی اس کے نتائج سے مشہود ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب وہ تیسری مثال لیجئے جہاں وحی کا لفظ انبیائے کرامؑ کے علاوہ دوسرے انسانوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔

(۱) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق ہے:

واذ اوحیت الی الحوارین ان امنوا بی و برسولی۔ (۵/۱۱۰)۔

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر۔

(۲) یہ قصہ سب کو معلوم ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت پر ان کی والدہ کے دل میں تردد لاحق ہوا کہ اس بچے کے متعلق کیا کیا جائے۔ فرعونی لوگوں کو پتہ چل جانے پر اسے بھی مار دیا جائے گا۔ اس موقعہ پر قرآن میں ہے:

واذ اوحینا الی امک ما یوحیٰ۔ ان اقذفیه فی التابوت..... الخ (۲۰/۳۷)۔

(اے موسیٰ) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی کہ وہ تجھے ایک صندوق میں ڈال دے اور اس صندوق کو دریا میں بہا دے.....۔

(۳) تیسری آیت حضرت یوسفؑ کے متعلق ہے جب ان کے بھائیوں نے انہیں کنویں میں ڈال دیا تو قرآن میں ہے:۔

واوحینا الیه لتنبئهم بامرهم هذا وهم لا یشعرون۔ (۱۲/۱۴)۔

ہم نے یوسف کی طرف وحی کی کہ تو انہیں ان کی اس کرتوت کے متعلق خبر دے گا درانحالیکہ وہ نہیں سمجھتے ہوں گے۔

یہ ہیں وہ مقامات جن سے محترم شاہ صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے جس میں نبی اور غیر نبی سب شامل ہوسکتے ہیں۔ یہی وہ الہام تھا جس کی رو سے رسول اللہ ﷺ عبادات سے متعلق اصولی احکام کی جزئیات متعین فرماتے تھے۔ یعنی حضورؐ کی طرف دو قسم کی وحی ہوتی تھی۔

(i) وہ وحی جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اور

(ii) وہ وحی جو قرآن میں نہیں، اسے الہام کہا جائے گا۔

اور یہ ''الہامی وحی'' اولیاء کرام کی طرف بھی نازل ہوتی ہے لیکن اس کی حیثیت ایک نبی کی ''الہامی وحی'' کے برابر نہیں ہوتی۔

یہی مقام غور طلب ہے۔

ان مثالوں میں، ایک مثال حضرت یوسفؑ کی ہے جو رسول تھے۔ لیکن محترم شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب حضرت یوسفؑ ہنوز شرفِ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال، باقی دو مثالیں یقیناً ایسی ہیں جن میں وحی کے لفظ کا استعمال غیر انبیاء کے لئے ہوا ہے۔ لیکن آپ ان مثالوں پر غور کیجئے۔ ان میں وحی کا لفظ صاف ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ ''میں نے بہت سوچا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ میں اسی عالم میں بیٹھا تھا کہ یونہی میرے جی میں آیا کہ ذرا

اس طرح کر کے دیکھو! میں نے یوں کیا اور معاملہ صاف ہو گیا۔'' یا اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہ ''میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی۔ میرے دل میں اللہ نے یونہی ڈال دیا کہ.....''۔ مذکورہ صدر مثالوں میں ''اوحینا'' کے معنی یہی ہیں کہ ''ہم نے امِ موسیٰؑ کے جی میں یہ ڈال دیا کہ وہ بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دے۔'' یا ''ہم نے حواریوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

کہہ دیا جائے گا کہ ان باتوں کو ان کے دل میں اللہ نے ڈالا تھا۔ یونہی خود بخود ان کے جی میں نہیں آ گئی تھیں۔ اسی کو الہام کہتے ہیں۔

لیکن محض اتنی سی بات سے کہ ان مثالوں میں اللہ نے وحی (دل میں بات ڈالنے) کی نسبت اپنی طرف کی ہے' الہام کے لئے سند نہیں لی جا سکتی۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ اس میں کئی ایسے امور کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے' جن کے متعلق یہ کہنا مقصود نہیں ہوتا کہ ان کا فاعل خدا ہے۔ کہنا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے قاعدے اور قانون کے مطابق سرزد ہوتی ہیں اور چونکہ وہ قاعدہ اور قانون خدا کا مقرر کردہ ہوتا ہے اس لئے ان کی نسبت خدا اپنی طرف کر لیتا ہے۔ سارا قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ختم اللہ علی قلوبھم (خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی) میں ''مہریں لگانے'' کی نسبت خدا کی طرف ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ مہریں انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یا مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

واذا اردنا ان نهلک قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرنها تدميرا (۱۷/۱۵)۔

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کر دیں تو اس کے عیش پسند لوگوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ فسق شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح ان پر سزا واجب ہو جاتی ہے تو انہیں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

یہاں بالکل واضح ہے کہ

(i) خدا یونہی بیٹھے بیٹھے یہ ارادہ نہیں کر لیتا کہ آؤ فلاں بستی کو ہلاک کر دیں۔ بستی والوں کے اعمال خود ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔

(ii) خدا مترفین (عیش پرست لوگوں) کو حکم نہیں دیتا کہ وہ فسق شروع کر دیں۔ وہ ایسے کام خود اپنی خواہشات کی رو سے کرتے ہیں۔

یعنی یہ سب کچھ ان قاعدوں اور اصولوں کے مطابق ہوتا ہے جو قوموں کی موت اور زندگی کے متعلق کارفرما ہیں۔ لیکن ان کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے۔ یہ قرآن کا خاص انداز ہے۔ اس لئے حواریوں کی طرف اور ام موسیٰؑ کی طرف وحی کرنے (یعنی ان کے دل میں بات ڈالنے) کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے تو یہ اسی انداز کی رو سے ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جس انداز سے حضرت موسیٰؑ کو پیدائش کے ساتھ ہی' فرعونی شکنجوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا گیا اور آپؑ کی پرورش خود فرعون کے گھر کے اندر کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مشیت کے اس پروگرام کے مطابق تھا' جو ایک رسول کی زندگی کے سلسلہ میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس لئے ام موسیٰؑ کے دل میں یہ بات یونہی نہیں آ گئی تھی بلکہ مشیت خداوندی کے مطابق پیدا کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے میں اس سے متفق ہوں (اور میں نے معارف القرآن جلد سوم میں اس کی یہی توجیہہ بیان کی ہے۔ یعنی یہ بات منجانب اللہ تھی)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف دو قسم کی وحی ہوا کرتی تھی۔ ایک وہ جو قرآن میں محفوظ ہے اور دوسری وہ جو محفوظ و ملفوظ نہیں' لیکن بایں ہمہ جزو دین ہے۔ اس امر کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ قرآن نے

نہ تو رسول اللہ ﷺ کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں بیان کی ہیں اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ قرآن کے باہر کہیں اور بھی وحی مل سکتی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو وحی رسول اللہ ﷺ کی طرف آئی تھی وہ اسی قرآن میں ہے۔ (اوحی الی هذا القران) ۔قرآن ہی وحی کیا گیا تھا۔ (نحن نقص عليك احسن القصص بما اوحينا اليك هذا القران وان كنت من قبله لمن الغافلين ۱۲/۲) اس لئے یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف دو قسم کی وحی آتی تھی۔ اور اس میں سے ایک وحی قرآن کے اندر ہے اور دوسری قرآن کے باہر' قرآنی تصریحات کے یکسر خلاف ہے اور اپنے ذہن کی تخلیق (یا محترم شاہ صاحب کے خود اپنے الفاظ میں' ذاتی رجحان کا نتیجہ)۔

ذرا سوچئے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت کیا لاحق ہوئی کہ دین کا کچھ حصہ ایک قسم کی وحی کے ذریعے نازل کرے اور کچھ حصہ دوسری قسم کی وحی کے ذریعے جسے روایت پرست حضرات وحی غیر متلو سے تعبیر کرتے ہیں اور محترم شاہ صاحب اس کا نام ''الہامی وحی'' رکھتے ہیں۔ وحی غیر متلو کے معنی ہیں ایسی وحی جس کی تلاوت نہ کی جائے۔ یعنی اسے قرآن میں نہ رکھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وحی ایسی تھی جسے اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) قرآن پڑھنے والوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اس لئے اس نے ایسی تدبیر اختیار کی جس سے رسول تک تو وحی پہنچ جائے لیکن وہ قرآن پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے نہ آئے۔ محترم شاہ صاحب نے اسے ''الہامی وحی'' قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ یہ وحی قرآن پڑھنے والوں کی نگاہوں سے بھی اوجھل رہے اور جبریل امین کو بھی اس کا پتہ نہ چلے۔ یعنی اسے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے دل میں ڈال دیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اسے قرآن میں نہ داخل کرنا کیونکہ قرآن کو مسلمان روز پڑھتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس وحی کی تلاوت کی جائے! سبحان الله تعالیٰ عما یصفون ۔اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ وہ وحی کے لئے اس قسم کی بالواسطہ تدابیر (Indirect Methods) اختیار کرے۔ قرآن شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملتا تھا حضور خود اس کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسے قرآن میں شامل کرتے تھے۔ اس کا ایک ایک حرف دوسروں تک پہنچاتے تھے اور یہی وحی اب قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ اس وحی کے بغیر حضورؐ کی حیثیت بشری تھی اور اس حیثیت کا نتیجہ تھی وہ بصیرت جس میں تمام انسان (اپنی اپنی استعداد کے مطابق) شریک ہوتے ہیں۔ یہی وہ بصیرت تھی جس کی رو سے خود حضورؐ خدا کی طرف دعوت تھے اور حضورؐ کے متبعین بھی۔ ادعوا الی الله علی بصیرة انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۷)۔ ''ان سے کہہ دیجئے کہ میں اللہ کی طرف بر بنائے بصیرت دعوت دیتا ہوں اور جو میری متابعت کریں گے وہ بھی اسی طرح اللہ کی طرف دعوت دیں گے۔'' یہی وہ بصیرت تھی جس کی بنا پر حضورؐ ان احکاماتِ الٰہیہ کی جزئیات متعین فرماتے تھے جن کے صرف اصول' قرآن میں آئے ہیں۔ محترم شاہ صاحب' اخلاق اور معاملات کی حد تک تو اس کے قائل ہیں کہ حضورؐ قرآن کے اصولی احکام کی تفصیلات' اپنی بصیرت کی رو سے متعین فرماتے تھے۔ لیکن ''عبادات'' کے معاملہ میں ان کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بصیرت کافی نہ تھی۔ اس کے لئے بصیرت کے اوپر' اور وحی قرآنی کے نیچے' کچھ اور ہونا چاہئے۔ اسی ''بین بین'' کے لئے انہوں نے ''الہامی وحی'' کی اصطلاح وضع فرمائی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق و معاملات اور عبادات کے اصولوں کی تفاصیل مرتب کرنے کے لئے اس قسم کی تمیز و تفریق کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ جو اصول اخلاق و معاملات کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے وہی اصول عبادات کے متعلق بھی کیوں نہ

اختیار کیا جائے؟ آپ مانتے ہیں کہ

(۱) قرآن کریم میں ایسے احکام ہیں جن کے صرف اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔

آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ

(۲) ان اصولی احکام کی جزئیات رسول اللہ ﷺ نے متعین فرمائی تھیں۔

لیکن اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ

(۳) رسول اللہؐ نے ان اصولی احکام میں سے اخلاق و معاملات کی جزئیات تو اپنی بصیرت کی بنا پر مرتب فرمائی تھیں لیکن عبادات کی جزئیات ایک اور طریقے سے متعین کی تھیں جسے ''وحی الہامی'' کہا جاتا ہے؟

ہم دریافت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ شق نمبر ۳ میں اخلاق و معاملات اور عبادات میں تخصیص کی کوئی وجہ اور اس کی کوئی قرآنی سند؟

آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ ''عبادات'' کو ''معاملات'' سے الگ کرنے میں، شعوری یا غیر شعوری طور پر وہی خیال کارفرما ہے جو مذہب نے ''دین اور دنیا'' کی تفریق کے سلسلہ میں پیدا کر رکھا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اخلاق اور معاملات کا تعلق دنیاوی اور معاشری امور سے ہے اس لئے یہ انسانی بصیرت کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ لیکن ''عبادات'' کا تعلق ''خدا'' سے ہے، اس لئے اسے بصیرت کی دسترس سے باہر ہونا چاہئے۔ یہ ہے وہ جذبہ جس کی رو سے ''عبادات'' کے لئے بصیرت سے اونچے ذریعۂ علم کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ یہ خیال اس قدر عام اور اتنے عرصے سے مسلسل چلا آرہا ہے کہ اس سے ذہن انسان کا (غیر شعوری طور پر) متاثر ہو جانا کچھ مستبعد نہیں۔ اسی کو محترم شاہ صاحب نے ''ذاتی رجحان'' سے تعبیر کیا ہے۔ ہمارے ''ذاتی رجحانات'' درحقیقت نتیجہ ہوتے ہیں ان معتقدات و خیالات کا جو ہمیں وراثتی طور پر ملتے ہیں یا جو اس ماحول میں منتشر ہوتے ہیں جس میں ہم پرورش و تربیت پاتے ہیں۔ لیکن قرآن کو محفوظ ہی اس لئے رکھا گیا ہے کہ ہم اپنے ''ذاتی رجحانات'' کو اس کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں جو اس پر پورے اتریں، وہ اس قابل ہیں کہ انہیں حریم قلب میں جگہ دی جائے۔ جنہیں وہاں سے سندِ صحت و صواب نہ ملے، انہیں کاشانۂ دماغ سے فوراً نکال باہر کیا جائے خواہ ان کے ساتھ کیسی ہی حسین یادداشتیں اور مقدس نسبتیں وابستہ کیوں نہ ہوں، کہ لات و منات، لات و منات ہی رہتے ہیں خواہ انہیں خود کعبہ کے اندر بھی کیوں نہ نصب کر دیا جائے۔

قرآن، اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک یہ سب ایک ہی نظام کے اجزاء اور ایک ہی مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ پانی، ہوا، مٹی، حرارت، روشنی سب مل کر (بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر) بیج کے تناور درخت بننے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دیکھئے! قرآن جہاں مومنین کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ ھم فی صلاتھم خاشعون (وہ اپنی صلوٰۃ میں خشوع برتتے ہیں) ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ ھم عن اللغو معرضون (وہ لغوبات سے اعراض برتتے ہیں)۔ جہاں کہتا ہے ھم للزکوٰۃ فاعلون (وہ زکوٰۃ کا نظم و نسق کرتے ہیں)۔ وہیں کہتا ہے کہ ھم لفروجھم حافظون (وہ جنسی تعلقات میں حدود اللہ کی نگہداشت کرتے ہیں)۔ جہاں کہتا ہے کہ ھم لا مانٰتھم وعھدھم راعون (وہ اپنی امانات اور عہد کی رعایت کرتے ہیں) اس کے ساتھ ہی کہتا ہے کہ ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون 7 (وہ اپنی صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں)۔ غور فرمایا آپ نے کہ کس طرح اخلاق و معاملات و عبادات، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، قدم بقدم ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اسلام کے نظام میں، عبادات، اخلاق و معاملات کے سنوارنے کا

ذریعہ ہیں اور اس طرح سنورے ہوئے اخلاق و معاملات خود عبادت بن جاتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ اخلاق اور معاملات' انسان اور انسان کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہیں اور عبادات' انسان اور خدا کے نجی تعلق کا نام ہے' اسلامی نظام کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اسلامی نظام میں عبادات کا تعلق براہ راست معاملات سے ہے۔ عبدیت (عبودیت۔عبادت) کے معنی ہی قوانین خداوندی کی اطاعت اور محکومی ہے۔ یہ تصور کہ عبادت کا مفہوم ''خدا کی پرستش'' (پوجا پاٹ) ہے مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ دین کا نہیں 8۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات ''مذہب پرست'' لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ''عبادت'' کس طرح معاملات کی دنیا میں دخل انداز ہوسکتی ہے؟ یہی وہ الجھن تھی جسے قومِ شعیب نے حضرت شعیبؑ کے سامنے اس تنقیدی انداز میں پیش کیا تھا جب کہا تھا کہ:

قالوا یشعیب اصلوٰتک تامرك ان نترك مایعبدا باء نا اوان نفعل فی اموالنا مانشوء (۱۱/۸۶)۔

انہوں نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ بھی حکم دیتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی ''عبادت'' ہمارے آباء کرتے تھے اور ہم اپنا مال و دولت اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔

وہ سمجھتے تھے کہ نماز ایک عبادت ہے۔ یعنی خدا کی پرستش۔ اسے اس بات سے کیا تعلق کہ ہم اپنا معاشی نظام کس قسم کا قائم کرتے ہیں! عبادات کو معاملات سے کیا واسطہ؟ یہی دلیل قوم شعیب پیش کرتی تھی اور یہی دلیل' تحریک پاکستان کے ضمن میں ہندوؤں کی طرف سے پیش ہوا کرتی تھی جب وہ کہتے تھے کہ مذہب' خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق کا نام ہے۔ اسے حکومت و سیاست (یعنی معاملات) سے کیا واسطہ؟ یہی ہے وہ جذبہ جو آج ہمارے اعماق قلب میں بھی غیر شعوری طور پر مچلتا رہتا ہے اور جس کی رو سے ہم اپنے تحت الشعور میں سمجھتے ہیں کہ عبادت کو معاملات سے الگ اور بلند رکھنا چاہئے اور یہی ہے وہ جذبہ جس کے ماتحت محترم شاہ صاحب اخلاق و معاملات کے اصولوں کی جزئیات کی تعیین کے لئے تو بصیرت کو کافی سمجھتے ہیں لیکن عباداتی اصولوں کی تفصیلات کے تعین کے لئے کسی الگ (اور بلند) ذریعے کی تلاش میں ہیں۔

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں بادب گذارش کریں گے کہ قرآن' اخلاق و معاملات و عبادات میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس لئے جو طریق کار اخلاق و معاملات کے قرآنی اصولوں کی جزئیات متعین کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا وہی طریق' عبادات کے قرآنی اصولوں کی تفصیلات کی تعیین کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ ان تمام تفاصیل کو نبی اکرمؐ نے اپنی بصیرت کی بنا پر متعین فرمایا تھا۔ بصیرت (جو قرآن کی روشنی میں روبعمل آئے) کوئی ایسی گھٹیا چیز نہیں جسے ہم اخلاق و معاملات سے تو وابستہ کر دیں لیکن اسے عبادات تک لے جانے میں جھجک محسوس کریں۔ آپ تو خود اس کے معترف ہیں کہ:

پیغمبر کی بصیرت و اجتہاد کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہوتی جسے ہم سرسری نظر سے دیکھ لیا کریں اور اسے معمولی درجہ دے کر ٹال جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے خود جزئیات متعین نہیں کیں بلکہ صرف اصولی احکام تک اکتفا کیا ہے۔ اس سے مقصود ہی یہ تھا کہ وہ اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی جزئیات میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے پیش نظر ردوبدل ہوسکتا ہے۔ اگر ان جزئیات کو بھی قیامت تک کے لئے (قرآنی اصولوں کی طرح) غیر متبدل رہنا ہوتا تو ان کا تعین خود وحی کے ذریعے (قرآن کے اندر) کر دیا جاتا۔ ان جزئیات کا تعین' قرآنی اصولوں کی روشنی میں' انسانی بصیرت پر چھوڑا گیا ہے۔ یہی رسولؐ اللہ نے کیا تھا اور یہی حضورؐ کے بعد کیا جائے گا۔ ایسا کرنے کے کا نام سنت رسول اللہ کی

اتباع ہے۔

باقی رہا اولیاء کرام کی طرف الہام خداوندی۔ سو اس کی سند قرآن سے کہیں نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اولیاء کرام کا جو تصور ہمارے ہاں عام ہے وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ قرآن کی رو سے ہر مومن' ولی اللہ ہے۔ یعنی ولی اللہ (خدا کا مطیع و فرمانبردار) ہونا مومن کی خصوصیت یا صفت ہے۔ جس طرح ہر مومن صادق (سچا) ہوتا ہے' اسی طرح ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ مومنین میں سے ایک خاص طبقہ اولیاء اللہ کا ہوتا ہے۔ جو لوگ قانون خداوندی کی اتباع کرتے ہیں وہ مومنین ہیں اور اس خصوصیت کے اعتبار سے اولیاء اللہ۔ جو لوگ غیر خدائی قانون کی اتباع کرتے ہیں وہ کافرین ہیں اور اس خصوصیت کے اعتبار سے اولیاء الشیطان۔ قرآن نے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی اصطلاحات کا استعمال انہی معنوں میں کیا ہے۔ مومنین میں سے کسی الگ طبقہ کا نام اولیاء اللہ نہیں رکھا۔

اصل یہ ہے کہ ولایت کا تصور بھی ''عجمی اسلام'' کا پیدا کردہ ہے۔ اور اسلام کے خلاف اسی سازش کا نتیجہ جس کا ذکر ان صفحات میں کئی بار آ چکا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے کے لئے جو سازش کی گئی اس کی پہلی کڑی یہ عقیدہ پیدا کرنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس وحی کے علاوہ جو قرآن میں محفوظ ہے' ایک اور وحی بھی دی گئی تھی جو قرآن کے ساتھ بالکل قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) ہے۔ یہ وحی روایات میں ملتی ہے' اس لئے روایات عین دین ہیں۔ یہ عقیدہ پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی روایات سازی کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے روایات کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ حالانکہ روایات کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہ ﷺ نے امت کو دیا تھا نہ خلفائے راشدینؓ نے مرتب کیا تھا۔ اس طرح اس دین کے مقابل جو اللہ نے دیا تھا' ایک اور ''دین'' مدون کر کے رکھ دیا اور اسے اتباع سنت رسول اللہ ﷺ قرار دے کر امت کو اس میں الجھا دیا۔

لیکن جب روایات کے مجموعے مرتب ہو گئے تو مزید ''دین سازی'' کی گنجائش نہ رہی اب اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان' عقل و بصیرت سے کام لینا نہ شروع کر دے۔ اس کے لئے الہام کا عقیدہ تراشا گیا۔ اور اس تصور کو عام کیا گیا کہ الہام چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لئے اس کا مقام عقل و بصیرت سے بہت اونچا ہے۔ اب روایات کی بجائے اولیاء اللہ کے ملفوظات مرتب ہونے شروع ہو گئے۔ اور اس طرح ایک تیسرا متوازی (Parallel) ''دین'' پیدا ہو گیا۔ روایات کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ قرآن کی ناسخ ہیں (اور دلیل یہ تھی کہ قرآن کا جو مفہوم رسول اللہ ﷺ سمجھ سکتے تھے وہ دوسرے مسلمان کس طرح سمجھ سکتے ہیں) اب یہ ''الہامات'' قرآن اور روایات دونوں کے ناسخ قرار پا گئے۔ اس دلیل کے ساتھ کی دین کا یہ مفہوم' براہ راست اللہ اور اس کے رسول کا سمجھایا ہوا ہے۔ اس لئے قرآن کے الفاظ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ ان الفاظ کا باطنی مفہوم بالکل ظاہر سے الگ ہے اور اس کا ذریعہ علم' سینہ بہ سینہ ''علم لدنی'' ہے۔ لیجئے۔ معاملہ صاف ہو گیا۔ روایات کے لئے تو پھر بھی دو چار راویوں کا نام لینا پڑتا تھا۔ الہامی ملفوظات کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ رہی۔ روایات کے لئے اگر رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کی طرف نسبت' وجہ کشش تھی تو ''الہامات'' کے لئے اس سے بھی بڑی کشش' کشف و کرامات کا وجود تھا۔ اس کشش و دلیل کے سامنے کوئی اور جاذبیت و برہان کام نہیں دے سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الہامات کے یہ آستانے دھڑا دھڑ کعبۂ مقصود بننے شروع ہو گئے اور نہ صرف یہ کہ یہ کشش صاحبان کشف والہام کی زندگی تک ہی محدود رہی بلکہ ان کے مرنے کے بعد' ان کے مزارات سے لپٹ گئی۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔

یہ امت خرافات میں کھو گئی

وحی کا دروازہ قرآن سے بند ہو گیا تھا۔ روایات سازی' احادیث کے مجموعے مرتب ہو جانے کے بعد ختم ہو گئی۔ لیکن الہام کا دروازہ

قیامت تک کے لئے کھلا ہے۔ بقول محترم شاہ صاحب۔

''وحی تنزیل کی طرح اس کا دروازہ بند ہونے کی کوئی سند نہیں۔''

میں اس وقت اس بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ کشف و کرامات کی حقیقت کیا ہوتی ہے (کیونکہ بعض لوگوں سے جو خلاف عادات امور صادر ہوتے ہیں ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا)۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔ (میں اس کے متعلق معارف القرآن میں بھی لکھ چکا ہوں اور عندالضرورت توفیق الٰہی اس کے بعد بھی لکھوں گا)۔ موضوع زیر نظر کے سلسلہ میں کہنا صرف یہ ہے کہ:

(۱) قرآن کی رو سے الہام کی کوئی دینی حیثیت نہیں، نہ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے، نہ حضورؐ کے بعد۔

(۲) جہاں تک دین کا تعلق ہے، وحی کی صرف ایک ہی قسم ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی تھی اور جس کی آخری صورت قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے بعد کوئی اس وحی سے سرفراز نہیں ہو سکتا۔ جو اس کا مدعی ہو وہ قرآن کے کھلے کھلے الفاظ میں مفتری علی اللہ ہے۔

(۳) قرآن کے ساتھ بصیرت عطا ہوئی ہے۔ اس لئے جن امور کی تفصیل قرآن نے خود بیان نہیں کی، ان کی تفصیل، قرآنی اصولوں کی روشنی میں، از روئے بصیرت متعین کی جائے گی۔ یہی رسول اللہ ﷺ نے کیا اور ہمارے لئے بھی ایسا کرنا منشائے قرآنی اور سنت رسول اللہ ﷺ کے عین مطابق ہے۔ اس باب میں اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی تفریق و تخصیص نہیں۔ اگر تفریق مقصود ہوتی تو عبادات کی جزئیات قرآن خود ہی متعین کر دیتا۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔ (اللہ کے لئے یہ بہت آسان تھا)۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی:

1. میں اس خط اور شاہ صاحب کے جواب کے اقتباسات اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ محترم شاہ صاحب نے انہیں اپنے مضمون کے ساتھ شائع فرما دیا ہے اس لئے یہ خط و کتابت نجی نہ رہی ورنہ میں اس خط و کتابت کا حوالہ نہ دیتا جب تک محترم شاہ صاحب سے اس کی اجازت نہ لے لیتا۔ (پرویز)

2. سوال یہ نہیں تھا کہ وحی الہامی کو تسلیم کر لینے سے وحی تنزیل میں فرق آ جاتا ہے یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اگر وحی الہامی دین کا جزو تھی تو اسے بھی وحی تنزیل کی طرح محفوظ ہونا چاہئے تھا۔ اس کا جواب نہیں دیا گیا۔

3. ذاتی رجحان کا دین میں کیا دخل؟ ایک چیز کے متعلق آپ کا دعویٰ ہے کہ اس کی سند قرآن میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عبادات کی جزئیات اس کی رو سے متعین فرمائی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ایسی اہم چیز کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے ایسا فقط اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کیا ہے؟

4. سوال فریق متخاصم کو شکست دینے کا نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے حقیقت کیا ہے؟ اگر کوئی بات قرآن سے ثابت ہو جائے اور اس سے ہمارے بڑے سے بڑے دعوے کی شکست ہو جائے تو یہ شکست اس فتح سے ہزار درجہ افضل ہے جو ہمیں اس دلیل سے حاصل ہو جائے جس کی سند قرآن سے نہ ملتی ہو۔

5. اگر سید صاحب کا حکم ماننا ضروری نہیں ہو گا تو پھر ''آئین پاکستان'' کے ضمن میں سید صاحب کا تذکرہ ہی بے معنی ہے۔ جب ان کی حیثیت ہی کچھ نہیں تو کسی کو اس سے کیا واسطہ کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں!

نیز یہ بھی واضح ہے کہ پاکستان کی رعایا ہونے کی جہت سے خود سید صاحب پر بھی لیاقت علی خاں صاحب کے حکم کی تعمیل واجب ہو گی۔ اس صورت میں اگر اللہ تعالیٰ سید صاحب پر کچھ الہام کرتا ہے تو اس الہام سے بالآخر فائدہ کیا جو نہ دوسروں کے ماننے کے لئے ہے اور نہ خود صاحب الہام کے ماننے کے لئے۔ تختۂ مسجد نہ قابل سوختن نہ درخور فروختن۔ پھر اس اللہ میاں کے متعلق کیا سمجھا جائے جو اس قسم کے الہام القا کرتا ہے جس کا فائدہ نہ صاحب الہام کو ہو نہ کسی اور کو۔ بقول غالب

زاہد نہ خود پیؤ نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

6. یہ سب سورۂ مومنون کی مسلسل آیات ہیں۔

7. میں دین اور مذہب میں جو فرق سمجھتا ہوں اسے متعدد بار ان صفحات میں بیان کر چکا ہوں اسلام دین ہے۔ یعنی نظام زندگی۔ ''مذہب'' نہیں۔ مذہب، دھرم کو کہتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ از ہر عباس، فاضل درسِ نظامی

امتِ مسلمہ کی نشأۃِ ثانیہ کا قرآنی طریقہ

جس طرح ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے قوانین جاری و ساری ہیں، اور پوری کائنات احکاماتِ خداوندی کے تابع چل رہی ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع چلنا چاہئے۔ طبعی زندگی میں تو انسان خود بخود قوانین خداوندی کے اتباع پر مجبور ہے۔ ہوا میں سانس لینا، تشنگی دور کرنے کے لئے پانی پینا، بھوک رفع کرنے کے لئے کھانا کھانا۔ ان امور کی سرانجام دہی پر انسان مجبور ہے۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی تمدنی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا ہی اتباع کرے اور اسی کو ہی حاکم اعلیٰ تسلیم کرے۔ فرعون اور حضرت موسیٰ کے مابین کشمکش کے دوران فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو دھمکی دی تھی کہ ولن اتخذت الٰھا غیری لا جعلنک من المسجونین ۲۹/۲۶، اگر تم میرے علاوہ کوئی اور حاکم تجویز کرو گے تو میں تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔ یہاں قرآن کریم نے الٰہ کا لفظ ٹھیک حاکم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی یہاں بنتا ہی نہیں۔ تمام انبیائے کرام نے یہی تعلیم دی کہ حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کسی کو حاکمیت زیب نہیں دیتی چنانچہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ فقال یقوی اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ ۵۹/۷، اے میری قوم تم صرف اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے علاوہ کوئی تمہارا حاکم ہونے کے لائق نہیں۔ بالکل یہی الفاظ حضرت ھودؑ نے اپنی قوم قوم عاد سے کہئے، والی عاد اخاھم ھودا، قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ ۶۵/۷، اے میری قوم تم اللہ کی اطاعت کرو اس کے علاوہ کوئی تمہارا حاکم نہیں، دیگر انبیائے کرام کی بھی یہی دعوت تھی کہ اللہ کے علاوہ کسی کی بھی اطاعت درست نہیں ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ ۴۳/۸۴، جیسے اللہ تعالیٰ آسمانوں میں حاکم ہے اسی طرح زمین میں بھی وہی حاکم ہے۔ وھو اللہ فی السمٰوٰت والارض ۶/۳، اور وہی حاکم ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، مزید ارشاد ہوا، ھو ربی لا الہ الا ھو ۱۳/۳۰، (کیونکہ) وہ میرا رب ہے (اس لئے) اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ یہاں باری تعالیٰ کی حاکمیت کے لئے ربوبیت کو وجہ جواز بیان کیا گیا ہے چونکہ وہی رب ہے، اس لئے اسی کو حکومت اور حاکمیت بھی زیب دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا، لا یشرک فی حکمہ احدا، انبیائے کرام کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہی ہوتا تھا کہ انسانوں کو انسانوں کی دست برد، ظلم و تعدی سے نجات دلا کر صرف

اورصرف اللہ تعالیٰ کی محکومیت میں لے آئیں اوراس طرح انسان کی حکومت انسان پرحرام قرار دے کرسب انسانوں کوایک صف اور درجہ میں لے آئیں اور ان کوشرف ومجد، عزت وتکریم عنایت فرمائیں، قرآن کریم نے آسمانوں پراللہ کی حکومت اور زمین پر انسانوں کی حکومت تسلیم کرنے سے بالکل منع فرما دیا ہے۔ لا تتخذوا الٰھین اثنین انما ھو الہ واحد ۱۶/۵، دوحاکم مت بناؤ، بس ایک حاکم وہی ہے۔ ولا تجعل مع اللہ الٰھا آخر فتقعد مذموما مخذولا ۲۲/۱۷، اللہ کے ساتھ اور کوئی حاکم مت ٹھہراؤ ورنہ تم بدحال بے مددگار ہوکر بیٹھ رہو گے۔ قرآن کریم کے نزدیک دنیا میں فساد برپا ہونے کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ آسمان اورزمین کے الگ الگ دوالٰہ تسلیم کرلئے گئے ہیں اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی اورحکومت کے بجائے انسانوں کی حکومت تسلیم کرلی گئی ہے۔

حضرت ھودؑ جب قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم عادکواللہ تعالیٰ کی حکمرانی اوراس کے الٰہ یعنی حاکم ہونے کی طرف دعوت دی۔ قوم کو استغفار وتوبہ کرنے کی فہمائش فرمائی۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی تبلیغ فرمائی۔ لیکن قوم نے روگردانی کی۔ جس کے بعدقوم پرعذاب آیااوراللہ تعالیٰ نے حضرت ھوداوران کے ساتھ مومنین کی جماعت کوعذاب سے بچالیا۔ سورۂ ھود میں یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے قوم عاد کا نقشہ ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ وتلک عاد جحدوا بآیات ربھم وعصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبار عنید ۱۱/۵۹، اور یہ (جن کا ذکر ہوا ہے) قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اوراس کے بعد رسولوں کی نافرمانی کی اورتمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اورضدی تھے، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قوانین سے انکار کیا، انبیائے کرامؑ کے احکامات سے بغاوت کی، لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کے بجائے ہر جبار اورضدی حاکم کی اطاعت کرتے چلے گئے اوراسی وجہ سے ان پرعذاب نازل ہوا۔ آج ہم بالکل اسی مقام پرکھڑے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے قوانین کوصرف کائنات کے قوانین تک محدود کردیا ہے اوراپنے معاشروں میں اپنے خودساختہ قوانین کا اجراء کرتے ہیں اور اپنے خودمقرر کردہ حکام اور امراء کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ حالانکہ بحیثیت مسلمان ہم پرفرض ہے کہ ہم اپنے معاشروں میں قرآنی قوانین کا اجراء کریں اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بھی حکومت تسلیم کرنے سے بالکل انکار کردیں۔ اس لئے کہ مسلمان کی تو قرآن کریم نے تعریف Definition ہی یہ کی ہے کہ جوقرآن کریم کے مطابق فیصلے کرے وہ مسلمان ہے اور جوقرآن کریم کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ جوبما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہ کریں وہ کافر ہیں۔

قرآن حکیم نے دین کا لفظ ٹھیٹھ ضابطہ حیات، نظریۂ زندگی، آئین، مملکت اورحکومت کے معانی میں استعمال کیا ہے۔ سورۂ یوسف میں دین الملک ۱۲/۷۶، شاہ مصر کے قانون کے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نور میں لا تاخذکم فیھا رافۃ فی دین اللہ ۲۴/۲، کے الفاظ استعمال کرکے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں تمہیں ان پررحم نہیں آنا چاہئے، خودواضح کردیا کہ دین کے معنی قانون وآئین کے ہیں۔ اسی طرح سورہ توبہ میں ہے ولا یدینون دین الحق ۹/۲۹، وہ اللہ تعالیٰ کے ضابطہ حیات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح سورہ توبہ میں حرمت والے مہینوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ذلک الدین القیم ۹/۳۶، اس میں بھی دین کے معنی ضابطۂ قانون کے ہیں۔ دین کے معنی واضح کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اورصرف الاسلام

ہی بطور دین کے مقبول ہے اور کوئی شخص اسلام کے علاوہ کوئی بھی ضابطۂ حیات اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول نہیں ہوگا۔ ان الدین عنداللہ الاسلام ۱۹/۳' اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے ومن یتبغ غیر اللا سلام دینا فلن یقبل منہ ۱۸۵/۳' جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کسی بھی ضابطۂ حیات کو اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوگا۔ ایک جگہ ارشاد ہوا' الا للہ الدین الخالص ۳/۳۹' یاد رکھو ضابطۂ حیات (مقرر کرنا) صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی سزاوار ہے۔ اور اسی کی اطاعت ہر شخص پر واجب ہے۔ لہٰذا دین سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام زندگی ہے جسے ہمارے معاشروں کی اساس و بنیاد ہونا چاہئے۔ اور جس نظام زندگی کو ہمارے معاشروں میں جاری و نافذ ہونا چاہئے۔ اگر ہم اپنے معاشروں میں اس نظام زندگی کو جاری نہیں کرتے تو ہم نہ تو صحیح معنوں میں مسلمان ہیں اور نہ ہی ہمارا خودساختہ آئین زندگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور نہ ہی ہم کسی بھی جہت سے اللہ تعالیٰ کی مدد کے مستحق ہوں گے اور جو وعدے اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام پر عمل کرنے سے وابستہ فرمائے ہیں وہ وعدے بھی پورے نہیں ہوں گے۔ فلہٰذا بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے خودساختہ قوانین حیات اور ضوابط ہائے زندگی کو یک قلم ترک کر دیں اور صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دین کے ماتحت زندگی بسر کرنی شروع کریں۔

قرآن حکیم نے جگہ بہ جگہ عدل کا حکم دیا ہے اور عدل کی تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذاقربی ۱۵۲/۶' اور جب تم بات کرو تو انصاف رکھا کرو اگرچہ وہ شخص آپ کا تو قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اسی طرح دشمن کے متعلق بھی فرمایا کہ ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ ۸/۵' لوگوں کی عداوت تم کو اس کا باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح حضورﷺ کو بھی حکم ہوا کہ وامرت لاعدل بینکم ۴۲/۱۵' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کیا کروں۔ اسی طرح اور متعدد مقامات پر عدل کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ لیکن قرآن کریم کے نزدیک عدل کا مفہوم بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ عام طور پر اگر کسی ملک کے قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے تو اسے عدل شمار کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ قانون خود کسی بھی قسم کا ہو اور یہ بات پیش نظر نہیں ہوگی کہ وہ فیصلہ عدل پر مبنی بھی ہے یا نہیں لیکن قرآن کریم کے مطابق عدل اسی فیصلہ کو شمار کیا جائے گا جو اس قانون کے مطابق ہے جو الحق یعنی وحی خداوندی کے مطابق ہے' اس کے نزدیک عدل و ظلم' حق و باطل' صحت و سقم کا یہی معیار ہے فرمایا کہ وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق و بہ یعدلون ۱۸۱/۷' اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے اور اسی کے مطابق عدل بھی کرتی ہے۔ قرآن کریم انسانوں کے خودساختہ قوانین کو نہ صرف یہ کہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ان کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن کریم اگر انسانوں کے خودساختہ قوانین کو سند (Recognize) کر لے' تو اس کی اپنی فوقیت اور اہمیت اور ترجیح باقی نہیں رہتی ہے۔ انسانوں کے خودساختہ قوانین اور ان قوانین پر مبنی عدالتوں سے رجوع کرنا' قرآن کریم کے مطابق بالکل حرام ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی عدالتوں سے رجوع کرتا ہے جن میں انسانی خودساختہ قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے ہوں' تو وہ شخص اللہ و رسول کے ہاں گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے کسی طرح بھی ان قوانین کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بھا ۶۰/۴' وہ چاہتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے

کہ اس کا بالکل انکار کر دیں۔ اس آیۂ کریمہ میں غیر خدائی قوانین سے فیصلہ کرانے کو بالکل منع کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جس ملک میں بھی ہو، قرآن کریم کے قوانین کے اجراء و نافذ کرنے کی کوشش کرے۔

لفظ زندگی یا حیات اور اس کے مرادفات عموماً ہر زبان میں ہی وسیع معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ زندگی سے مراد صرف طبعی زندگی، یعنی سانس لینا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، وغیرہ اور موت سے مراد صرف مرجانا، یعنی سانس اور حرکت کا ختم ہو جانا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے وسیع تر معانی مراد ہوتے ہیں مثلاً جب کسی قوم کے لئے یہ کہا جائے کہ وہ مردہ قوم ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اس قوم کے تمام افراد قبروں میں دفن ہو گئے ہیں یا اگر کسی قوم کو زندہ قوم کہا جائے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ قوم سانس لے رہی ہے۔ زندہ یا مردہ قوم کا مفہوم واضح ہے۔ قرآن کریم نے بعض مقامات پر حیات و ممات کے یہی وسیع تر مفاہیم بھی اختیار کئے ہیں۔ جو نفس مضمون کے تسلسل سے واضح ہو جاتے ہیں۔ حضورﷺ کے متعلق سورہ یٰسین میں ارشاد ہوا لینذر من کان حیاً ۳۶/۷۰ تا کہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جو زندہ ہیں۔ یہاں حیاً یعنی زندہ کا لفظ قرآن کریم نے ٹھیک ان ہی لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے جن میں زندگی کے آثار اور حرارت موجود تھی ورنہ ظاہر ہے کہ حضور قبروں میں دفن شدہ مردوں کے انذار کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح سورہ انعام میں ارشاد ہوا۔ اومن کان میتا فاحیناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ الناس ۶/۱۲۲ اور کیا وہ شخص جو مردہ ہو اور اسے ہم پھر زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلے پھرے"۔ یہاں بھی بالکل واضح ہو رہا ہے کہ یہاں موت و حیات سے مراد طبعی زندگی اور موت نہیں ہے۔ بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے۔ انبیاء کرام کا مقصد ہی مردہ اقوام کو زندہ کرنا، اور انہیں نئی زندگی عطا کرنا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اسی مفہوم کو واحی الموتیٰ باذن اللہ ۳/۴۹ کہہ کر بیان فرمایا تھا کہ وہ مردہ قوم کو قانون خداوندی کے ذریعے زندگی عطا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس (وسیع المفہوم) زندگی کے حاصل کرنے کا طریقہ قرآن کریم نے بیان فرمایا کہ یاایھا الذین امنوا استجیبوا للہ ولرسول اذا دعاکم لما یحیکم ۸/۲۴ ایمان والو! اگر تم اللہ و رسول کی پکار کا جواب دو گے تو وہ تمہیں زندگی عطا کر دے گا اور اس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام، جس کو حضورؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا، اس کی اطاعت زندگی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں تو اتنی قوت ہے کہ وہ مردہ قوم کو زندہ کر دے۔ اس لئے اگر مسلمانوں کو دوبارہ زندگی حاصل کرنی ہے تو ان پر واجب ہے کہ قرآن کریم کا عطا کردہ نظام قائم کریں۔ اس کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ انہیں قرآن کریم کے وعدہ کے مطابق یقیناً زندگی حاصل ہوگی اور وہ لازماً زندگی کی سرفرازیوں سے متمتع ہوں گے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ اور یقیناً تم ہی سب سے اعلیٰ ہو گے اگر تم مومن ہو۔

چونکہ انبیائے کرامؑ پر اپنی وحی کے مطابق معاشرہ قائم کرنا فرض ہوتا تھا اس لئے سابقہ انبیائے کرام نے اپنے اپنے دور میں اپنی وحی کے مطابق حکومتیں قائم فرمائیں۔ حضورﷺ کو بھی اسی غرض سے مبعوث فرمایا گیا تھا کہ وہ نہ صرف دین کا قیام عمل میں لائیں بلکہ اس دین کو تمام دیگر ادیان باطلہ پر غالب فرما دیں ھو الذی ارسل رسولہ باالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ۴۸/۲۸ وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ حضورﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے

سارے جزیرۃ العرب میں اس دین کو جاری فرمایا۔ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے اسی دین کو بلاکم وکاست جاری رکھا' تا آنکہ مسلمانوں کی بدقسمتی بلکہ ساری انسانیت کی بدبختی اور حرماں نصیبی کہ اس نظام پر ملوکیت غالب آ گئی اور وہ نظام جاری نہ رہ سکا۔ ہر نظام کے قیام واجراء اور اس کے برقرار رہنے کے لئے ایک مضبوط اساس کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو اس نظام کے جذبۂ محرکہ اور Incentive کے طور پر اس نظام کو قائم رکھتا ہے۔ حضور کے قائم کردہ دین یعنی اسلامی نظام کی اساس متین اور بنیان مرصوص یہ تھی کہ اس نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت قرار دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین جس کو حضور ﷺ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا' اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں جب تک وہ دین قائم رہا' اس دین (نظام) کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اللہ و رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کے نظام کی اطاعت تھی۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں اللہ و رسول کے الفاظ استعمال کئے ہیں' اس سے مراد اسلامی نظام ہے۔ جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے' وہاں اس سے مراد اسلامی نظام کی اطاعت مقصود ہے۔ (اس سلسلہ میں اس ادارہ کا مضمون 'اساس محکم' ملاحظہ فرمائیں) اس نقطۂ نگاہ کی تائید میں قرآن کریم سے متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن بوجہ اختصار صرف تین آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو مزید آیات درکار ہوں وہ ''اساس محکم'' ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) جنگ احد جب مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور چند مجاہدین کی غلطی سے فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی اور حضور ﷺ بالکل تن تنہا رہ گئے تو آپ نے مجاہدین کو حوصلہ دیا اور ان کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ جمع ہو گئے حالانکہ یہ حضور ﷺ کی آواز تھی۔ لیکن چونکہ یہ حضور ﷺ کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہ مملکت آواز دی تھی اس لئے اس آواز کو اللہ ورسول کی آواز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابتھم القرح' للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم ۳/۱۷۲۔

جن لوگوں نے اس کے بعد کہ ان کو زخم لگا' اللہ اور رسول کے کہنے کو قبول کرلیا۔ ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں' ان کے لئے ثواب عظیم ہے۔

(۲) یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا' جو انہوں نے حضور ﷺ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو اللہ اور رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے' کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی مخالفت تھی۔

ذلک بانھم شاقوا اللہ و رسولہ ومن یشاقق اللہ و رسولہ فان اللہ شدید العقاب ۸/۱۳' (ترجمہ) یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ اور رسول کی مخالفت کرتا ہے سو اللہ تعالیٰ اس کو سخت سزا دیتا ہے۔

(۳) ایک آیۂ کریمہ اس بارے میں اس مفہوم کو ثابت کرنے کے لئے بہت ہی واضح اور بین ہے اور حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔

ومن یخرج من بیتہٖ مہاجرا الی اللہ و رسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ مکان اللہ غفوراً رحیماً ۴/۱۰۰۔

اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ ورسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ جائے تب بھی اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت اور رحمت کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کر کے جانے

سے سوائے اسلامی حکومت (مدینہ منورہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا۔

ان آیات کریمات سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ قرآن کریم نے اللہ ورسول کے الفاظ اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کئے ہیں۔ جس سے مراد اسلامی حکومت کے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت سے مقصود اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت مراد ہوتی ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس نظام کی اطاعت ہے۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت در آئی تو یہ قرآنی نظریہ بھی تبدیل ہو گیا اور اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے اس نظام کی اطاعت کے بجائے قرآن و حدیث کی انفرادی اطاعت تصور کر لی گئی۔ یہ مسلمانوں کے زوال کی پہلی اور بنیادی وجہ تھی اور اس سے وہ جذبہ محرکہ اور Incentive باقی نہیں رہا جس کی بنیاد پر وہ نظام قائم تھا کیونکہ اس نظریہ کی تبدیلی سے نظام کے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اجتماعی اطاعت کی بجائے انفرادی اطاعت کا جواز مہیا ہو گیا۔ اب ہر شخص فرداً فرداً قرآن وحدیث کی اطاعت کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مراد قرآن کریم کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا ذریعہ احادیث کی اطاعت قرار پایا۔ اس سے اسلامی نظام کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ آج تک دوبارہ اسلامی نظام کسی جگہ بھی قائم نہیں ہو سکا۔ اور ملوکیت نے ایسا استقلال پکڑا کہ آج تک مسلمان ممالک اس چنگل سے نہیں نکل سکے اور یہی ملوکیت کا مقصود بھی تھا۔ اگر مسلمانوں میں ملوکیت آ بھی گئی تھی تاہم اگر یہ قرآنی نظریہ تبدیل نہ ہوتا تو اس بات کا امکان تھا کہ کچھ عرصہ بعد پھر اسلامی نظام قائم ہو جاتا۔ لیکن غضب تو یہ ہوا کہ وہ تو سرے سے یہ قرآنی نظریہ ہی بالکل بدل دیا گیا اور اس طرح اسلامی نظام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ فکری طور پر اس نظریہ کو عام کیا جائے۔ جب ہم مسلمان اس بات کے قائل ہوں گے کہ اللہ و رسول کی اطاعت اس کے دیئے ہوئے نظام کی اطاعت سے ہوتی ہے تو خود بخود اس نظام کو جاری کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہ نظریہ کہ اللہ و رسول کے الفاظ قرآن کریم نے بطور ایک اصطلاح کے استعمال کئے ہیں اور جس سے مراد اسلامی حکومت کے سربراہ اور حاکم اعلیٰ ہیں' اس کی تائید مزید قرآن کریم کی متعدد آیات کریمات سے ہوتی ہے' جن پر قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے الفاظ لا کر ان کے لئے ضمائر واحد کی استعمال کی ہیں۔ حالانکہ عربی قواعد کے مطابق ان کے لئے تثنیہ کی ضمیر لانی لازمی تھی ان آیات میں سے صرف دو آیات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ' ان کانوا مومنین ۹/۶۲۔

(ترجمہ) مومنو یہ لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کر دیں۔ حالانکہ اگر یہ (دل سے) مومن ہوتے تو خدا اور اس کا رسول خوش کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بات واضح ہے کہ اللہ اور رسول کے لئے ضمیر واحد لائی گئی ہے لیکن اللہ اور رسول ایک تو نہیں ہو سکتے۔ پیغام دینے والا اور پیغام وصول کرنے والا ایک نہیں ہو سکتے عابد و معبود ایک نہیں ہو سکتے۔ پس اللہ اور رسول کے لئے واحد ضمیر لا کر یہ بات ثابت کرنی مقصود ہے کہ یہ اطاعت صرف ایک اطاعت ہے' اور اس سے مراد اسلامی حکومت کے سربراہ کی ذات ہے۔

(۲) اغنٰھم اللہ و رسولہ من فضلہٖ ۹/۷۴۔

انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ یہاں بھی واحد ضمیر لا کر واضح کر دیا کہ اس سے مراد وہ مرکزی نظام ہے جو اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کر دیا اور جس میں قوانین خداوندی ہی جاری وساری ہیں اور اسی وجہ سے اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اللہ ورسول کی اطاعت ایک ہی اطاعت ہے اور اس سے عملاً مراد اسلامی حکومت کا سربراہ ہے' فی الوقت ان دو آیات کریمات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

آج ساری دنیا میں فساد ہی فساد نظر آ رہا ہے۔ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون ۳۰/۴۱' (ترجمہ) خود لوگوں ہی کے اپنے ہاتھوں کی کارستانیوں کی بدولت خشک وتر میں فساد پھیل گیا ہے تاکہ جو کچھ یہ لوگ کر چکے ہیں خدا ان کو ان میں سے بعض کرتوتوں کا مزا چکھا دے تاکہ یہ لوگ (اب بھی) باز آ جائیں۔ قرآن کریم کے نزدیک صرف بدامنی' لاقانونیت' قتل و غارت' سلب ونہب ہی فساد نہیں ہے' بلکہ قرآن کریم کی نظر میں ہر وہ نظام جو قرآن کریم کے نظام کے خلاف ہو' جس میں رزق کے سرچشموں پر قابو کر کے' دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر' معاشرہ کا توازن بگاڑ دیا جائے' وہ فساد پر مبنی نظام ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں آیت بالا میں فرمایا کہ جب لوگوں نے غیر خدائی نظریات وتصورات کو قانون خداوندی کا ہمسر بنا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں۔ یہ ناہمواریاں خود لوگوں کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔ ان کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آ چکے ہیں۔ اگر یہ غور سے دیکھیں تو یہی نتائج اس بات کے لئے کافی محرک ہو سکتے ہیں کہ یہ اپنے خود ساختہ نظام زندگی سے منہ موڑ کر 'نظام خداوندی' کی طرف رجوع کریں۔

انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے حیات نے انسانیت کو سکون واطمینان فراہم نہیں کیا۔ آج سارے عالم اسلام میں شدید بحران واضطراب کی کیفیت ہے اور مسلمان مختلف ممالک میں اس طرح منقسم ہو گئے ہیں کہ اجتماعی قوت کا کوئی تصور بھی ان میں باقی نہیں رہا ہے اور خود مسلم ممالک بھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں اور اگر کسی مسئلہ پر ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی چاہتے ہیں تو بین الاقوامی حالات' مدد کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے۔ ان مایوس کن حالات میں مسلمانوں کو زندہ کرنے کی واحد صورت' قرآن کریم کے نظام کو قائم کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ قرآن کریم کا اپنا دعویٰ ہے کہ اللہ ورسول کی پکار پر جواب دینے والوں کو وہ زندگی عطا کرتا ہے (۱۸/۲۴) آج مسلمان اگر اللہ ورسول کی پکار پر جواب دیں تو انہیں یقیناً زندگی مل سکتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا اٹل وعدہ ہے' جو کسی حال میں جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ صرف پکار کے مفہوم کو صحیح سمجھنا ہے۔ اللہ ورسول کی پکار صرف ورصرف ایک پکار ہے' جو اس کے نظام کی پکار ہے اور اسی پکار کے جواب میں مسلمانوں کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ لیکن جب تک ہم مسلمان اللہ اور رسول کی پکار کو قرآن وحدیث کی الگ الگ' دو پکاریں سمجھ کر جواب دیتے رہیں گے اور انفرادی طور پر ان پر عمل کرتے رہیں گے' مسلمان کبھی بھی زندگی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

رب اعوذبک من ھمزٰت الشیطین واعوذبک رب ان یحضرون ۲۳/۹۷-۹۸۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

قرآنی تعلیمات اور اس کے تقاضے

یہ ایک تلخ حقیقت ہے، تلخ اس لیے کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب جس حالت میں بھٹک رہے تھے، آج ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں لیکن ایک فرق کے ساتھ، وہ یہ کہ ان کے پاس اصل کتاب باقی نہیں رہی تھی، ہمارے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ ہم مسلمان جب چاہیں اس کے مطابق کسی بھی ملک میں اجتماعی نظام کر کے اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اس طرح ممکن ہوگا کہ فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو سب سے پہلے الوداع کرنا ہوگا، قرآن میں اہل کتاب کے متعلق ہے کہ انہیں کتاب دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس پر عمل کریں۔ انہوں نے کتاب کو تو سر آنکھوں پر اٹھا لیا لیکن اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا۔ (اللہ کی کتاب سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اسے سوچ سمجھ کر پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ کتاب کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر اٹھائے پھرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی گدھے پر بڑی بڑی کتابیں لاد دی جائیں اور وہ انہیں اٹھائے اٹھائے پھرے۔ یہی مثال اس قوم کی ہے جو قوانین خداوندی کا زبان سے اقرار کرے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرے۔ اس قوم کی حالت جس قدر زبوں ہوسکتی ہے ظاہر ہے ایسے لوگوں کو جو اللہ کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کریں کبھی رہنمائی نہیں مل سکتی۔ لیکن زعم باطل یہ کہ ساری خدائی میں صرف ہم ہی خدا کے پیارے ہیں، دین اسلام نام ہے خدائی اقدار کے ساتھ اجتماعی نظام زندگی کا۔ اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے اللہ نے ہمیں قرآن بطور ضابطہ حیات، بلا کسی معاوضہ کے عطا فرما کر حکم دیا کہ تم سب مل کر اسے تھامے رکھنا اور فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے، مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ اس لیے سورۃ الانعام میں اللہ رب العزت نے رسول اکرم ﷺ سے کھلے کھلے الفاظ میں فرمایا کہ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں، اے رسول ﷺ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اللہ سے قوم کا تعلق رسول ﷺ کی وساطت سے ہوتا ہے۔ جب فرقوں میں بٹ کر رسول اللہ ﷺ سے ہمارا واسطہ نہ رہا تو اللہ سے تعلق کیسا؟ ان آیات کو سامنے رکھئے اور سوچئے کیا ہمیں ان سے سرکشی کی سزا اس دنیا میں نہیں مل رہی؟ رہی بات آخرت کی تو کیا ہمارا شمار مسلم قوم کے ان افراد میں سے نہیں ہو جاتا جنہیں دیکھ کر یوم قیامت رسول کریم ﷺ پکار اٹھیں گے کہ یارب یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا۔ ہمیں اس حقیقت کو پیش نگاہ رکھنا چاہئے کہ یہ ضروری نہیں جو قوم اس دنیا میں خوش حال ہوگی اس کی آخرت بھی تابناک و درخشندہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ جو قوم اس دنیا میں ذلیل و خوار ہے اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہوگی۔ یہ اللہ کا قول ہے کہ اس دنیا کا اندھا آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

(بشکریہ جنگ لندن، بابت 23 ستمبر 2003ء)

THE PROPHET OF ISLAM

(Poetry Iambic Pentameter)

By

Elsa Kazi

==========

The World in bondage lay, ‘t was dark and bleak
Humanity no more the ‘Light could seek.
With ignorance and superstitions drunk
Humanity in heavy sleep had sunk.
The Ebb had come, an ebb so low and drear
It seemed the tide could never re-appear.
No hope was left for lost humanity
And earth and heaven groaned in agony.
Then in the desert barren and forlorn
A voice announced: “THE MESSENGER IS BORN”.
Then flashed a radiance thro’ the desert gloom
The tide advanced to make the desert bloom.
The waste into a field of flowers turned
And for the ‘Light’ the least and lowest yearned
When Prophet’s voice across the desert hurled:
“Arise and Warn” the waking, groping world
Then rose from bed of sloth and low desire.
And made impetuous effort to aspire.
Each man was to the other reconciled
Humanity became the Prophet’s child.
From him it learnt to walk, to talk, the way
To read and write, to understand and lay
Foundation of its greatness; and to free
Itself and future world from tyranny.
It saw the way; it was no longer blind;
It learnt to discipline its infant mind.
It grew an ‘adult’ with a heart of steel
That could inspite of this so deeply feel.
With tenderness which is the sweetest trait
Of maiden hearts. It dropped all pride and hate.
‘T was fed on milk of high morality,
It learnt the noble art of chivalry.
To look with pity at the fallen foe;
To soothe afflicted hearts, and orphan’s woe.
To ‘give’ with joy and generosity,

To live for ‘service’ in humility.
To tolerate the creeds of other lands,
To join with men of every colour, hands.
And prove that man is bound by blood
Of ‘spirit’ not by body’s crimson flood.
The Prophet said: “In search of Knowledge go”.
And every Muslim let his home, to know
With spades and axes travelling round the earth
To excavate and seek the things of worth.
To make each value grow in breadth and height,
And make it glisten with superior light.
Not to retain the treasures, but bestow
The gems upon the ‘poor’ and make them grow
With wealth of knowledge rich. The Prophet said
Man should respect all things that God hath made,
Respect for ‘woman’ he did initiate.
On earth a paradise he did create,
Where man to every creature paid respect,
And never tried to trace an odd defect,
But value found in all, and knew a thing
That useless seems may sudden blessings bring.
The Prophet counselled envy to efface
Since all is God’s, wherever eyes do gaze
The East, the West, the fleeting time and space;
All universe man’s vision should embrace.
And Muslims learnt the uphill road to climb,
Emotions wild to lead to heights sublime.
To free the slave, and save the man that lies
In dust, to teach all fallen men to rise.
To tell the beggar not to beg, but give
Him lessons in a trade, to ‘work’ and live.
The Muslims learnt all matters to decide
With reason’s aid and ne’er a lie to side.
In judging never use high-handed might,
Nor let falsehood triumph over ‘Right’.
The Prophet swept away the ignorance
Of man’s belief that all was nought but chance.
He spoke of Destiny to which each soul
Is bound, and every Muslim learnt ‘control’,
To walk in harmony with God’s design
And learn Submission to the law Divine-

The Prophet cleansed the human heart of doubt.
The man the Signs of God pointed out.
The stars, the sun, the moon, the sky the sea;
The wind, the rain, the lovely greenery,
The ripening fruit; the wondrous Sign that lines
In seed that opens, grows and blooms, then dies,
In pearls, in minerals, in bird and bee,
In all creation's perfect harmony,
Where eyes may look and never can detect
A flaw. He counselled Muslims to reflect
On all the wonders that creation held
Till love and awe the Muslim mind compelled
To ponder on the signs, to understand,
And wonders find in every grain of sand.
And Muslims studied then each plant and tree,
The flowers, birds and beasts, the treasury
Of earth they did explore, and patiently
They deeply probed in Nature's Mystery
Evolving EVOLUTION'S history.
They found the trail of man's forgotten past;
And life's beginnings in relief they cast.
Quran, the holy Book their source became
Whence they derived all knowledge and all fame.-
The Prophet said, sun cannot overtake
The moon, and night its course can never break
To outstrip day, each floats within a sphere
Till its appointed term is ended here.
And Muslims studied sun and moon and stars,
And found that none can move beyond its bars,
They know, its limits when a thing exceeds
It chose the path that to destruction leads
The Prophet pointed out the ships that sail
Upon the sea, withstanding wave and gale
And do not sink; of BALANCE Prophet thought
The meaning of his words the Muslims caught,
And balance-point in every thing they sought.
In 'EVEN' and in 'ODD' the Prophet saw
A sign, that pointed to Creation's LAW
To add 'NEGATION' that nature reigns,
And AFFIRMATION' that the world sustains.
Experimental Science reared its head

Foundation of Research the Muslims laid.
In books they stored the wisdom they had found
That man should read and stand on firmer ground;
Islamic Culture spread from end to end,
Its 'light' acknowledged was by foe and friend
The world had glimpses of Eternity,
Of Heaven and of Immortality.-
With Muslim music all the world was cheered,
The wandering minstrels everywhere appeared,
That sang of God, of faith, of happiness,
Of sacrifice, of loveliness,
With Science and Romance the world was thrilled,
With love and poetry the hearts were filled.
The barren earth became a paradise,
For truth had come, and dead were sins and lies.
Alas… the modern Muslim different seems;
Oblivious of his past, he plots and schemes;
The golden days of 'Truth' he quite forgot,
Who gave him freedom he remembers not.
He gropes in darkness now as once before,
Quranic values now his senses bore,
To them his ears are closed, he will not hear
Of things that purged his being of all fear
Of things that courage brought, that power gave
To body and to soul, a world to save
From chaos and destruction. Now he drifts
In discontent from place to place he shifts;
For ever seeking what he lost, and yet
Not knowing what he seeks; torn with regret
Not guessing why his spirit so doth fret
He plunges into greed, and seeks in vain
'Lost Paradise' in every worldly gain
The Ebb returned, life's waters to recede
Now more and more starvation, dearth and need
Abound; where once abundance poured its wealth
But misery is found, and waning hearth.
For body and for soul there is not 'Bread'
And hungry man false power grabs instead.
At Mammon's throne he worships in despair
But weird inflated deity doth not care,
And showers piles of paper, that do pave

The way to hell. Thus man became slave
Of rank illusions; he again is blind
No more he owns the 'seeing' adult mind.
"A toy… a toy… give me a toy", he says,
And with the tinsel-toys all day he plays.
He runs from serious talks, and will not wait
To hear Quranic verdict of the fate
That faithless nations for themselves create,
He quakes to listen in his wretched state.
For him so stale Quranic views became,
"Equality" is but an empty name;
And "Brotherhood" a signal is to shed
A brother's blood; with pride his heart is fed.
The chain of Unity to pieces broke
To bear it now would prove a heavy yoke.
The party spirit rules; the clan, the clique,
Not even that, for man of ties is sick.
The ties hat tied him to diviner source
Are cut, and downward, downward runs his course.
'Tis man' gainst man and each the other fights
For bogus justice and bogus rights
Each fights the other for a higher place
That makes him lower, robs his soul of grace,
And of that quality thro' which we pass
By worth from lower ranks to higher class,
"SINCERITY", the passport that was given
To Soul by which alone 't may enter Heaven.

(Words and their meanings are the very essence of a language. That is why Tolu-e-Islam has always been wary of translations, or a substitution of one word of a particular language into another language. In this case, otherwise a beautiful and a powerful poem, the word "Prophet" "for Nabi" is misleading. "Prophecy" as understood by the Jews is completely irrelevant to the mission of the *Nabi*. He fulfils his mission if he communicates the *Wahi* as he has received it, without adding to or taking away anything from it. His purpose is not to prognosticate but to offer moral guidance to man in the light of Divine Revelation. This is clear from another term which is applied to a *Nabi.* He is *"Rasool"* or messenger.

The Quran is explicit on this point:

> O Children of Adam! Whenever messengers come to you from among you, who narrate to you My Revelation, then whosoever follows it and amends, there shall come no fear upon them nor shall they grieve (7:35).

So the term "Prophet" in the poem may be considered as "Messenger". It makes all the difference. Tolu-e-Islam.)

==========

Laws of Nature

(A Letter to Grand Children)

By
Rashid Samnakay-W. Aust.

==========

My dear Uzmeena and Abid

I am glad that your exams went well. You must have worked hard at your studies. Every thing else being fair and just, you should get good result for your efforts. However you ask me to pray (duaa) for your success. My good wishes are with you, although I am sure you are mindful of Allah's promise to us "…*never will I suffer to be lost the work of any of you, be they male or female"* 3-195.

The fact that you have both combined to raise the issue of hard work and its consequences (reward) is a sign that you are turning your attention to the broader issues now that you are free and on holidays. However you seem to be also concerned with the plight of the Muslims all over the world to day! It is understandable, considering the sad news all around us!

While Physics is still fresh in your mind, I thought I should utilise the following to address some of the topics raised in your e-mail.

Mechanics of ad-Deen (God's laws of Requital)

Some physical laws of nature can also be applied to the laws governing a society. For example it is possible to apply the Newtonian laws of motion, in a generic sense, to the Code of life 'ad-Deen' as given in Quran.

Consider the 1st law of motion:

> 1st law-A body remains in its state of rest unless it is compelled to change that state by a force impressed on it.

If the word 'body' is replaced with the word 'society', then simply put, it would mean that ***action*** is required to change the status quo of the society if it is desired to make a change to it. However it is essential to know what kind of change is required.

In the context of ad-Deen, the imperative is that there has to be a *conscious realization,* in the first place, that the status quo is detrimental to the *salaah and falaah*- welfare and developmental progress of the community at large and therefore it needs to be changed.

In the absence of this conscious realisation, that is, the absence of *knowledge* of the harm produced by *the status quo* compared to the benefits accrued from the change, the change itself may turn out to be harmful if in the wrong direction.

Therefore Quran emphasises the acquisition of *Ilm* (knowledge) as being the primary requirement. For a Muslim aware of the teaching of Quran, references abound in this respect. With this prerequisite it states that:

Verily never will God change the condition of a people until ***they change it themselves*** *-13-11.*

Let us now consider the 2nd law of Motion:

2nd Law-the change of motion is proportional to the force impressed on the body.

Simply put, the amount of change is proportional to the effort put in bringing out the required change in the society. Quran says- *that man can have nothing, but what he strives for 53-38.*

In a society the change can be brought by *evolutionary* or *revolutionary* means.

By and large one finds that Quran is in favour of evolutionary change as it is argumentative rather than prescriptive, for how often does it extol us - *then why don't they think, why don't you contemplate, 34-46,7-179 etc?*

Lastly the 3rd law of Motion:

3rd law- to every action there is an **equal** and **opposite** reaction.

The benefits or loss accrued are directly proportional to the endeavour employed in executing that change. Again Quran is abound with statements in this respect – *for every soul to receive its reward by the measure of its endeavours 22-15.* is **in fact the essence of Deen.** There is no such thing as 'something for nothing' in life! For, any benefits to be accrued, the *endeavours* have to be based on the full knowledge- *ilm*, that is understanding of the strength and weakness of the change and the *rate and direction of change* is to be brought about. *Faith* (conviction) in the knowledge and appropriate ***action*** is therefore the main factors and the reward is then exactly proportional for all humanity, Muslims and non-Muslims alike, according to the laws of nature, to the effort put in bringing about that change. The concept of disproportionate reward, something for very little (eg like gambling), for Muslims is a 'religious' concept and completely alien to the Deen of Islam.

Knowledge-*Ilm*

Quran stresses the acquisition of all facets of knowledge, which is enlightenment (*noor*) through God's signs. Lack of knowledge is referred to as *zulum*-darkness. The importance of the archaeological, historical, astronomical and many other branches of science are referred. The importance of travel in many a verses is stressed such that it seems to imply that *travel* to acquire knowledge is almost a *fardh (*compulsory*)* for it says in many places- *do they not travel through the land so that their hearts (and minds) may thus acquire wisdom 22-46.* Unfortunately this injunction is hardly ever stressed by our so-called scholars, whose branch of knowledge is often restricted to 'religion'.

Action –*Amal*

The edifice of **reward** *jazaa* (and therefore Jannah/Jahannam) in Deen is built on **Action** *amal.* Action is a dynamic concept. As High School students you know the definition of Work: -- Force times distance. More precisely, the *act* of producing an effect by means of a force (F) whose point of application moves through a distance (S) in its own line of *action*. Unless and until there is an action, there is no result or outcome (reward, thawaab) - *That mankind can have nothing but what it strives (saee) for 53-38,* makes it clear that the journey of *salaah* and *falaah* is not an easy ride. The action required to achieve progress and development, demands that little bit more, taking that one step extra to cross the line. Even to maintain a *status quo,* if it is worth maintaining, an effort is required to stop it from sliding back into ruin.

Hence to think that, just to verbalise *aamanu wa amilus saalihaat*(believe and do the righteous acts) is to recite the *kalimaa* as the evidence of one's *Iman* (faith) and to perform a few ritualistic acts, as a manifestation of *Amal* to produce the required **reward** for oneself**,** is to say the least, a delusion of the first order. That, there is no effort and no endeavour required on the individual's part, except may be a few spiritually induced movements of the body where no practical/measurable/tangible result is obtained. It is like pushing or pulling a load number of times a day, without shifting it at all in any direction, no **work** is done! Although a lot of calories are expended. It could be argued that if that is the result sought in the first place (as physical exercise for example), then some thing has been achieved such as weight-loss or fitness, on an individual basis. It depends upon the aamil's (doer's) own concept of reward- *Walaa tujzawnaa illa ma kuntum taamaloon.*36-54, for you shall be rewarded (*jazaa)* for only what you ***worked*** for.

As said earlier, action is a dynamic concept and every action required to be performed in the context of ad-Deen, there is this underlying idea of deliberate/conscious action,

performed to bring about a change, however minute, for the *salaah and falaah* of the society. The action always requires effort (hard yakka in your slang). If carried out with the aid of appropriate knowledge will, under the fixed laws of nature always produce positive results. The converse is equally true that, with inappropriate knowledge, however great the effort, if applied ignorantly will produce no results or worst, even negative results.

Among Muslims, these laws in the matter of *religion* (rituals), are applied at individual's spiritual level, for the **disproportionate reward**, some times in the ratio of one to seventy two or even one to thousands, which is akin to gambling, (forbidden in Quran). There are a few such ritualistic efforts among us with no positive outcome for the society at large.

Let us take one glaring example, the Hajj, which is **actioned** simultaneously by a very large number of Muslims gathered at one place, at Mecca, and consumes lot of their energy with no tangible return to show for the society at large. I must emphasise that Hajj is a *Quranic injunction* and as such, it must have therefore, a reason and a purpose behind it.

Approximately three million Muslims annually make the *effort*, spiritually, physically, financially and emotionally to go for Hajj. Every individual returns with the belief of:

- Spiritually fulfilled -- feel good sensation
- Cleansed of all the previous sins -- concept of 'confession' and absolution, borrowed from other religions
- Uplift in ones social/religious status in local society on return -- titled Hajji/Hajja or al Hajj (in some Muslim cultures it is an excuse then for a man to take a second wife!)

All the above, achieved purely on the basis of individual's spiritual fulfillment. We should ask, but what does the society as a whole get out of the effort, let alone the humanity in general? Let us enumerate:

The Positives

1. Often foreign Travel agencies and Airlines make lots of money out of the pilgrims.
2. Saudi government make heaps of money in taxes, visa fees and injection of billions of dollars cash in its economy.

3. Cotton mills sell huge amount of white cloth, generally manufactured by foreign owned mills. However a few third-world countries sell cotton to them.
4. Employment and income to the *Hajj package* and the *religious* industry.
5. The income from the hide of the slaughtered animals help finance a few *religious* institutions achieve their agenda.

The Negatives

1. Large number of people return with exotic diseases.
2. Drain on foreign exchange of the already majority poor third-world Muslim countries.
3. Hardly any increase in general knowledge and historical knowledge is gained, for one is not allowed to step outside the hajj precincts.
4. Because the effort is specifically focused on individual spiritual fulfillment, almost no contact is established with the Muslim Ummah. No new lasting friendships are forged with different Muslim nationalities to establish the *brotherhood of* Muslims.
5. In spite of the huge gathering, no discussion and/or decisions are taken to alleviate the myriads of traumas affecting the Muslim Ummah, let alone humanity in general. Although one must concede that lots of *duas* are uttered for the oppressed in Palestine, Kashmir, Achey, Bosnia, Chechnya etc at the exclusion of all other human miseries and traumas.
6. Often quite a few human lives are lost due to crowd mismanagement, uncontrolled fires, traffic and other accidents.
7. Lots of animals lose their lives and generally their meat is wasted. For example the royal Pulao in polythene bags, a gift from the Rulers, tossed out of trucks at Arafaat and is trampled upon.

Surely, one is entitled to expect some return from the efforts of so many Muslims gathered in one place at such a great cost! I would go even further and say that the *injunction* to gather together-*jamaat*-must have some significance for the Ummah!! It can't be just to gain individual spiritual communication with Allah, who never the less is every where and *closer to us than (our) jugular vain, 50-16* and not that HE lives in *His house,* only in Mecca! Nor can it be to add billions of Dollars to the coffers of the Government there, which squanders it on war efforts by others, waged against Muslims and Muslim countries, as exemplified recently (an issue that I see has disturbed you both very much and quite rightly so!). If any thing this Ummah

should take steps to alleviate the traumas of Humanity as a whole. Does not Quran say - … *you are an Ummah raised for the good of* ***humanity*** *3-110.*

Sincere supplications and prayers alone, offered there without any resolve of positive actions to be taken for the benefit of the Muslims the world over, do not bear any fruit! So you are both right to ask-- Why is there no change in our condition for the better in spite of the Duaas of all those Muslims and especially at **such a holy place**?

Newton did not invent the above laws, he merely discovered God's laws of requital. Misdirected efforts produce negative or no results just as in any other human endeavours! You are fond of quoting Iqbal, don't you? Remember he said:

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے

Your supplications are that your desires be fulfilled.
I pray that HE may instead, change your desires!

My dear grand children - Indeed, spirituality has its place in our lives, but then for a Muslim **all *saaleh* (positive) endeavours are spiritually uplifting experience!**

Finally I attach an e-mail I received from a friend to demonstrate the difference between practicality and spirituality and leave the rest for you to contemplate:-

"Prophet Mohamed S.A.W. said to Murtuza Ali a.s. "before you sleep every night, you need to do the following things" : Give away as sadaka 4000 dinar \Read the Holy Quran once \Pay your dues for Heaven\Resolve a problem between 2 persons \ Go for Hajj once.

Hazrat Ali a.s. said 'but this is impossible' – in reply the Prophet told Hazrat Ali a.s. 'if you do the following five things, this will be equivalent to the above mentioned things that I have said to you' - : Recite *Sura Fatiha* four (4) times and this is equivalent of giving 4000 Dinars in Sadaka \Recite *Sura Ikhlas* three (3) times and this is equivalent of reading the whole Quran\ Recite *Salwat* **(**Darud) three (3) times and that will pay for your dues in Heaven. \Recite *Astagfirrulah tasbi* ten (10) times and that is equivalent to solving a serious problem between 2 persons**. \(** Recite four (4) times *Subhan-allah, Wal-hamdullil-allah wala illaha illalalallahu..* This is equivalent to going for Hajj once!!"

Enjoy your holiday; you deserve it assuming of course that you had worked hard for the exams!
Dadajan